

مجموعۂ مراثی

بیادِ حضرت مولانا محمد مصطفیٰ جوہر اعلی اللہ مقامہ

سلام

مولانا محمد مصطفیٰ جوہر اعلی اللہ مقامہٗ

جب اُحد میں کھینچتے تھے تیغ حیدر بار بار
لافتیٰ کہتے تھے جبرئیل و پیمبر بار بار

مل گیا بستر شبِ ہجرت علیؑ کو مل گیا
جانشینی کا نہیں ملتا ہے بستر بار بار

یاد رکھو! اپنے ایماں کی گواہی کے لئے
ہم مناتے ہیں غمِ سبطِ پیمبر بار بار

بار بار آتی رہی بن بن کے دنیا سامنے
اور علیؑ مارا کئے ٹھوکر پہ ٹھوکر بار بار

کرتے جاتے شاہ کے قدموں پہ سر اپنے نثار
زندہ گر ہوتے بہتر کے بہتر بار بار

یاد آ جاتی تھی جب بھی روزِ عاشورہ کی پیاس
چومتے تھے لب نواسے کے پیمبر بار بار

کہتے ہیں اتمامِ حجت، طالب نصرت نہیں
یہ جو ھل من ناصر کہتے ہیں سرور بار بار

ایک سجدہ جو کیا سبطِ نبیؐ نے وقتِ عصر
ایسے سجدے میں نہیں جھکتا کوئی سر بار بار

دو قدم چل کر مرے آقا کہیں تو بیٹھتے
کہتا تھا عابدؑ سے زنجیروں کا لنگر بار بار

رونے پاتی تھیں نہ اپنے وارثوں کو بیبیاں
تازیانے سے ستاتے تھے ستمگر بار بار

کیا عجب عباسؑ، حضرت سے کہیں کیجے کرم
آستاں پر آپ کے آتا ہے جوہر بار بار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جواہر

مجموعۂ مراثی

بہ یادِ
حضرت مولینا محمد مصطفیٰ جوہر اعلی اللہ مقامہ

مرتب: آغا سید قمر حسنین جعفری

اشاعت بہ اہتمام
مولینا محمد مصطفیٰ جوہر ٹرسٹ
۶۴-ڈی۔ بلاک ۶، فیڈرل بی ایریا، کراچی فون نمبر ۶۸۲۲۲۶

دائرۂ طباعت

نام کتاب ــــــــــــــــ جواہر

موضوع ــــــــــــــــ مراثی بہ یادِ مولینا محمد مصطفےٰ جوہر اعلی اللہ مقامہٗ

طابع وناشر ــــــــــــــــ مولینا محمد مصطفےٰ جوہر ٹرسٹ

۶۴۔ڈی، بلاک ۶، فیڈرل بی ایریا، کراچی

مرتبہ ــــــــــــــــ آغا سید قمر حسنین جعفری

عمل سرورق ــــــــــــــــ ید اللہ حیدر

خطاطی ــــــــــــــــ نور محمد بھٹی

تعداد صفحات ــــــــــــــــ

پرنٹر ــــــــــــــــ حیدری پرنٹرز ایم۔اے جناح روڈ، کراچی

سنِ اشاعت ــــــــــــــــ ۱۹۹۲ء

ترتیب

التماس

درج ذیل مرحومین کے ایصالِ ثواب

کے لئے

سورۂ فاتحہ کا ملتمس ہوں

مولانا محمد مصطفےٰ صاحب جوہر اعلی اللہ مقامہ

آغا محمد حسنین جعفری | سید ناظم حسین جعفری

ثامنہ خاتون بنتِ ناظم حسین جعفری | ام لیلیٰ بنتِ ناظم حسین جعفری

سید آلِ اطہر ابن سید آلِ نبی

روشن آرا بیگم بنت آلِ اطہر

ملتمس:-

آغا سید قمر حسنین جعفری



حضرت مولانا محمد مصطفیٰ جوہر اعلی اللہ مقامہ

ہدیہ تشکر

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مولانا محمد مصطفےٰ جوہر ٹرسٹ پاکستان کی طرف سے ایک مجموعہ مراثی موسوم بہ جواہر طبع ہو کر مومنین کرام کے ہاتھوں کی زینت بن چکا ہے مولانا مرحوم کی شخصیت ان کی علمی قابلیت اور مذہبی و ادبی خدمات کا ایک زمانہ مقر ہے اس سلسلے میں ایک الگ کتاب شائع کی جارہی ہے جس میں علمائے کرام کی آرا مستند ادیبوں کے مقالے اور خود مولانا مرحوم کی شعری و نثری تخلیقات شامل ہیں۔

مجھے مولانا مرحوم سے عقیدت اپنے والد مرحوم سید محمد حسنین جعفری کے سبب پیدا ہوئی جو مرتے دم تک مولانا مرحوم کے عقیدت مندوں میں شامل رہے۔

زیر نظر کتاب میں کلیم آلِ عبا جناب شاہد نقوی، وحید مودت جناب وحید الحسن ہاشمی اور جناب اسیر فیض آبادی کے شخصی مراثی شامل ہیں ان شعرائے کرام نے جس محنت لگن اور عرق ریزی سے مولانا مرحوم کے کمالات فیوض و برکات پر خامہ فرسائی کی ہے میں تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مولانا جناب تقی ہادی صاحب اور ڈاکٹر آغا سہیل کا شکر گزار ہوں جنھوں نے تعارف اور مقدمے میں وقیع خیالات کا اظہار کیا ہے میں ان تمام مومنین سے جن کے مبارک ہاتھوں میں یہ منظوم نذرانۂ عقیدت پہنچ چکا ہے درخواست گزار ہوں کہ وہ براہِ کرم مولانا مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کے لئے ایک سورۂ فاتحہ سے ضرور نوازیں گے۔

خاکپائے اہلبیت

آغا سید قمر حسنین جعفری

سلام

مولانا محمد مصطفیٰ جوہر

حیدرؑ کا جسے نقشِ کفِ پا نہیں ملتا
اس کو کہیں فردوس کا رستہ نہیں ملتا

اِسلام ہی اسلام کا غل چار طرف ہے
لیکن کوئی ایماں کا شناسا نہیں ملتا

ہے مخزنِ الطافِ الٰہی درِ شبیرؑ
اس در سے عزاداروں کو کیا کیا نہیں ملتا

حیرت میں ہیں دریائے تعقل کے شناور
حیدرؑ کے فضائل کا کنارا نہیں ملتا

جلوہ ہے مودت کا سرِ طورِ عقیدت
موسیٰؑ سے کہو، دیدۂ بینا نہیں ملتا

آدمؑ کی جو اولاد کہی جاتی ہے انساں
اس اسم کا کثرت سے مسمّیٰ نہیں ملتا

پرواز میں کرتا نہیں توصیفِ علیؑ میں
جبرئیل سے جب تک کوئی نکتہ نہیں ملتا

شبیرؑ کے روضے کی دکھا دیتا فضیلت
مجبور ہوں فردوس کا نقشہ نہیں ملتا

داغِ غمِ شبیرؑ ہے رجعت کی سحر تک
غیبت میں تو اِس داغ کو پھاہا نہیں ملتا

راتوں کو رباب اٹھ کے کہا کرتی تھیں، لوگو
پہلو میں مرا راج دلارا نہیں ملتا

جوہر! یہ فقط اولِ مخلوق کا حق ہے
ہر ایک کو معراج کا رتبہ نہیں ملتا

ایک تعارف !

آئینہ الفاظ میں نقوشِ حیاتِ سرکار جوہر صاحب قبلہ (مرحوم)

از:- مولانا تقی ہادی نقوی

علم فضائلِ انسانی کے خوش رنگ و خوش بو پھولوں سے کشید کیا گیا وہ "جوہر" ہے جسے اصلِ اصولِ کمالاتِ بشری قرار دیا گیا ہے۔ یہ وہ سرمایہ ہے جو انسان کے لئے مایۂ ناز بھی ہے اور دیگر مخلوقات کے مقابل مابہ الامتیاز بھی۔

ارشادِ معصومؑ کے مطابق علم نور ہے۔ نور کا وصف ہے..... خود ظاہر ہونا اور دوسرے کے لئے مظہر یعنی ظاہر کرنے والا ہونا، اس اعتبار سے نہ علم کو احتیاجِ تعارف ہے اور نہ صاحبِ علم ہی اپنے تعارف کے لئے غیر کا منت پذیر ہوتا ہے۔ علم اور صاحبِ علم وہ گل ہیں جن کی شمیم منتشر ہونے کے لئے نسیمِ صبح گاہی کی محتاج نہیں۔ وہ نافہ ہے جو مشامِ شوق کے لئے فطری کشش رکھتا ہے۔

اس مسلمہ حقیقت کے ہوتے ہوئے کسی صاحبِ علم کے تعارف کا مسئلہ.....؟ عالم بھی وہ جو مخازنِ علومِ معصومین علیہم السلام سے اپنے مستقل نظری و عملی تعلق کے سبب کمالِ علم کی اس منزل پر فائز ہو جہاں خود علم فخر کرتا نظر آئے۔ جہاں جمیع تشنگانِ علوم اپنے مسائل دریافت کر کے آپ کے جواب سے یوں مطمئن ہو جائیں کہ ان مسائل کے سلسلہ میں بحث و تمحیص کی شدید گرما گرمی میں بھی آئندہ کبھی تشنگی کا احساس نہ ابھرے

میری اس گفتگو کا محورِ عالی جناب زبدۃ العارفین، زین المتکلمین، سید الواعظین عالمِ علومِ ربانی، کاشفِ اسرارِ فرقانی عمدۃ العلماء الاعلام حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد مصطفٰے

صاحب قبلہ جوہر رفع اللہ درجاتہٗ فی اعلیٰ علیین کی ذاتِ گرامی ہے۔

درحقیقت یہ سرکار مولانا اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے تعارف کی کوشش نہیں اور کم مائگی و کم علمی کا احساسِ قوی رکھنے والے مجھ لیسے ایک ادنیٰ طالبِ علم کے یے ایسی مجمع الصفات جلیل القدر ہستی کا تعارف کرانا ہی ممکن نہیں ہے۔ اصل میں یہ اُس استفادۂ علمی کے عوض جس کی سعادت آپ کی ذات گرامی سے اس ناچیز کو بھی گاہ گاہ حاصل رہی ہے سپاس گذاری کی ایک حقیر کوشش ہے جس کا مقصد سرکار اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی سیرت کے معلوم نقوش کو ضبط تحریر میں لاکر آنے والی نسل کے لئے علم و عمل کا وہ بہترین اور کامل نمونہ پیش کرنا ہے جو تا بقائے تحریر ہذا مستقلاً رہنمائی کا ذریعہ رہے۔

لیکن افسوس ہے کہ بعض وجوہات سے سرکار مرحوم کی گراں بہا زندگی کے مفصل حالات ہمیں معلوم نہ ہو سکے۔

اولاً یہ کہ سرکار مرحوم کے مخلصین پر کچھ ایسا غفلت کا پردہ پڑا رہا گویا اس حقیقت ہی کو بھولے ہوئے تھے کہ مولانا مرحوم کو ایک دن ہم سے جدا ہونا ہے۔ بلکہ بسبب شدتِ عقیدتمندی ایسا تصور بندھا ہوا تھا کہ ہمیشہ ہی ہمارے پاس رہیں گے۔ اس لئے بہت سی باتیں جو پوچھنا تھیں نہ پوچھ سکے۔ بہت سی خاص چیزیں جو لینا تھیں اور جواب کسی دوسری ذات سے نہیں مل سکتیں نہ لے سکے۔

دوسرے سرکار مولانا قدس سرہٗ کے بیشتر وہ مخلصین جنھیں آپ سے قدیم رفاقت کا شرف اور مستقل استفادۂ علمی کی سعادت حاصل رہی تھی رحلت فرما گئے اور آج دارالخلد میں حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ قدیمی نسبت و تعلق کو نبھا رہے ہیں۔ چند وہ حضرات جو موجود ہیں اور نعمتِ حیات سے بحمد اللہ بہرہ مند ہیں بسبب اپنی طویل العمری و ضعف جسمی و ذہنی سرکار مرحوم کے بارے میں وہ سب کچھ نہ بتا سکے جو وہ جانتے ہیں۔

آخری وجہ اس ناچیز کی عدیم الفرصتی اور نااہلی ہے جو قدم قدم سدِ راہ رہی نتیجتاً چند ماہ گزر جانے کے باوجود بھی سرکار مرحوم کے بعض ذی علم عقیدت مندوں سے وہ تمام کچھ نہ حاصل کرسکا۔ جو ان حضرات سے یقیناً مل سکے گا۔ بہرحال یہ کوشش جاری ہے۔ بارگاہِ ایزدی میں مسلسل طالبِ دعا بھی رہتا ہوں کہ مجھے اس خدمت کی ادائیگی کی بھرپور توفیق عطا ہو۔

المختصر جو کچھ جستہ جستہ ان مخلصین وواقفین سے نیز سرکار مرحوم کے فرزند اکبر خلف الرشید رئیس العلماء الاعلام سید الخطباء العظام حجۃ الاسلام حضرت علامہ طالب جوہری مدظلہٗ العالی سے ملا وہ مجملاً نذر قارئین کر رہا ہوں۔ یقینِ کامل ہے کہ ناظرینِ کرام اسی سے سرکار مرحوم اعلی اللہ مقامہٗ کی سوانح عمری کے نتائج تک پہنچ سکیں گے۔

صاحبِ چشمِ بصیرت پہ ہے یہ راز عیاں
قطرۂ آب میں دریا کے ہیں کل وصف نہاں

ولادتِ باسعادت اور تعلیم وتربیت

سرکار مولانا محمد مصطفیٰ صاحب قبلہ جوہر کا آبائی تعلق حسین گنج ضلع سیہوان۔ بہار (انڈیا) سے تھا۔ آپ کی ولادت مئی ۱۸۹۵ء میں اسی شہر میں ہوئی تھی۔ آپ کے والدِ ماجد حضرت مولانا حکیم محمد مسلم صاحب قبلہ مرحوم نہ صرف اپنے زمانے کے ممتاز اطباء میں تھے بلکہ تاریخِ عالم بالخصوص تاریخِ اسلام کے صفِ اول کے محققین میں بھی آپ کا شمار ہوتا تھا۔ آپ کا رسالہ " عالمِ برزخ میں ملجلؔ " (بجواب شررؔ) آپ کی حیات ہی میں قبولیتِ عامۃُ المومنین کا درجہ حاصل کرچکا تھا۔

حکیم صاحب قبلہ مرحوم نے ابتدائی چند سال حسین گنج میں گزارے بعدہٗ بہ سبب علمی

و دینی وجوہ کھجوہ ضلع سارن (بہار) نقلِ مکانی فرمایا اور پھر یہیں مستقلاً رہائش پذیر ہوئے۔
سرکار مولانا جوہر صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا "اُمِّی" تعلق اسی شہر کھجوہ سے تھا۔
آپ کی والدہ ماجدہ یہاں کے ایک ممتاز خانوادۂ علمی سے تعلق رکھتی تھیں۔ جس کی ایک شہرۂ آفاق ہستی مولانا حکیم سید علی اظہر صاحب نقوی اعلیٰ اللہ مقامہٗ مرحوم کی تھی جو اپنے وقت کے بے مثل مناظر تھے۔ جن کی نگرانی و سرپرستی میں جاری ہونے والا علمی و دینی رسالہ "اصلاح" آج تک اپنے معیارِ علم معتدبہ و خدمتِ دینِ حقہ کے سبب آپ اور آپ کے خلفُ الرشید حضرت مولانا علی حیدر صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہٗ مرحوم کے جلالتِ علم اور سعادتِ خدمتِ دین پر روشن دلیل بن کر آپ کے مستقل تعارف کا ذریعہ رہا ہے۔
قارئین کرام خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے علمی خانوادوں میں جہاں علم میراثِ اب وجد کی صورت منتقل ہو رہا تھا۔ پرورش یافتہ ہستی اور علم کے اِس دوآبہ سے آبیاری پانے والی کشتِ روح پرور سے غذائے روحانی لینے والی ذات کا اپنا مقامِ علمی و آگہی کیا ہوگا؟
چناں چہ حضرت مولانا محمد مصطفےٰ صاحب قبلہ جوہر ایسی قدآور شخصیات کے زیرِ سایہ ایسے ماحول میں جس کا گوشہ گوشہ اذکار و افکارِ علمی اور شعائر و اطوارِ دینی کے لائقِ تقلید مظاہرِ مناظر سے لبریز تھا، پلے، بڑھے اور پھر وہ کچھ بنے جو شخصیت بننا چاہتی تھی۔
خاندانی روایات کے مطابق سرکار مولانا اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے تعلیم کی ابتداء اپنے والدِ ماجد حکیم صاحب قبلہ مرحوم سے کی بعدہٗ عربی کی باقاعدہ تعلیم اپنے زمانہ کے جید عالم حجۃ الاسلام مولانا حاجی سید محمد تقی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہٗ مرحوم و مغفور سے حاصل کی۔ آپ حضرت مفتی محمد عباس صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ کے شاگردِ رشید تھے۔
یوں سرکار مولانا جوہر صاحب قبلہ حسین گنج اور کھجوہ دونوں مخازنِ علوم گراں مایہ سے بھرپور فیض یاب ہوتے کے بعد اسی سرمایۂ علمی کو بطورِ رختِ سفر لے کر وقت کے عظیم بلدۂ علمی لکھنؤ

تشریف لائے اور سلطان المدارس میں باقاعدہ رسمی تعلیم کا آغاز کیا اور اسی درس گاہ سے صدرالافاضل تک تمام امتحانات درجہ اوّل میں پاس کرکے اپنی فطرت ذہانت اور موروثی استعداد کا وہ مظاہرہ فرمایا کہ لکھنؤ کے علمی حلقوں میں آپ کی ذات محتاجِ تعارف نہ رہی۔ یہی وہ مستقل بنیاد تھی جس پہ کھڑی ہونے والی عمارت اپنی بلندیوں کے اعتبار سے ہر آسمانِ عظمت و شرف کو چھو رہی تھی۔

لکھنؤ کے قیام اور درس گاہ جلیلہ میں تعلیم و تعلّم کے دوران جن عظیم القدر اساتذہ کرام سے کسبِ علم کا مستقل سلسلہ رہا ان میں اُفقِ علوم ظاہریہ و باطنیہ، معنویہ و حقیقیہ، ابدانیہ و ادیانیہ کے نیّرانِ تاباں مولانا سیّد باقر صاحب قبلہ، ظہور الملّت مولانا ظہور حسین صاحب قبلہ مولانا محمد رضا صاحب قبلہ فلسفی، مولانا وجاہت حسین صاحب قبلہ ناظم وغیرہم اعلی اللہ مقامہم (مرحومین) شامل ہیں۔ علاوہ ازیں دورانِ قیامِ بہار مولانا راحت حسین صاحب قبلہ گوپالپوری سے بھی استفادہ کیا۔ ایسے ذی علم اساتذہ کرام کو جن کی علمی عظمت و جلالت مسلمہ ایک لائق شاگرد کا ملنا اور ایک فطری ذہانت، خداداد صلاحیت اور موروثی رجحانِ علمی رکھنے والے شاگرد کے لیے ایسے عظیم المرتبت اساتذہ کا میسر آنا خدائے علیم و قدیر کا خصوصی انعام تھا۔ قدرت کا اہتمام اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ مشیتِ ایزدی سرکار مولانا اعلی اللہ مقامہ (مرحوم) کے ذریعہ علوم معصومینؑ کی نشر و اشاعت اور احکامِ دین کی تبلیغ و ترویج کا مستقبل میں ایک مستقل و مستحکم بندوبست چاہتی ہے۔ چنانچہ سرکارِ مولانا مرحوم نے اپنی زندگی کا بنیادی مقصد بھی یہی قرار دیا تھا۔ آئندہ سطور میں پیش کیے جانے والے حقائق اس دعوے کے لیے ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کر دیں گے۔

یہ بات بطور کلیہ تسلیم کی گئی ہے کہ حقیقی تشنہ گانِ علوم دریائے علم سے جوں جوں سیراب ہوتے ہیں۔ ان کی تشنگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حضرت مولانا مرحوم بھی ایسے ہی تشنہ گانِ علوم سے تھے۔ چنانچہ آپ نے کلکتہ سے ہائی اسکول پاس کیا۔ نیز الہ آباد بورڈ اور پٹنہ یونیورسٹی سے علومِ شرقیہ کے تمام اعلیٰ امتحانات میں بھی بدرجہ اوّل کامیابی حاصل کی بلکہ فاضل عربی

کے امتحان میں پٹنہ یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن بھی حاصل کی۔
رسمی تعلیم کی اس تکمیل کے بعد دریچہ ہائے ذہنی کھلے اور کھلتے چلے گئے۔ شوقِ علمی کی شدت نے رسمی کسبِ علم کی دربندی کے بعد مطالعہ ذاتی کی راہ کھول دی۔ چنانچہ یہ سلسلہ ارشادِ رسولؐ پر عمل کرتے ہوئے کہ تحصیلِ علم مہد سے لحد تک جاری رہے، تابقائے ہوش آخرِ عمر تک قائم رہا۔ جب تک بینائی تھی خود مطالعہ کیا اور اتنا کیا کہ جس کا تصور ہی انسان کو حیران کر دیتا ہے۔ بکثرت و باتسلسل مطالعہ کی اس حقیقت کا کچھ اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب سرکار مولانا اعلی اللہ مقامہٗ مرحوم ناظم آباد کی قدیم رہائش گاہ سے نارتھ ناظم آباد (عقب سیفی کالج) میں واقع نئے مکان میں منتقل ہوئے تو نتیجتاً سرکار مرحوم کا کتب خانہ بھی منتقل کیا گیا۔ اس وقت تمام کتب کی ازسرِنو ترتیب کے فریضہ کی تکمیل حضرت علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے ساتھ، جناب پروفیسر سردار نقوی صاحب اور اس ناچیز نے کی۔ دورانِ ترتیب جس جس کتاب کو ضرورتاً کھولا گیا تو یہ دیکھ کر ہم لوگ حیران رہ گئے کہ ان کے اوراق پر کہیں نہ کہیں سرکار مولانا اعلی اللہ مقامہٗ مرحوم کے تحریر کردہ حواشی موجود تھے۔ یہ صورت اس امر پر دلالت کر رہی تھی کہ ہر کتاب آپ کے مطالعے سے گزر چکی ہے۔ سرسری نہیں بلکہ بنظرِ عمیق (قارئین کرام یہ ملحوظ رکھیں کہ سرکار مولانا کے کتب خانے میں اُس وقت دس ہزار سے زیادہ کتب تھیں۔)
بینائی سے محرومی کے بعد بھی یہ شوقِ مطالعہ نہ رُکا، نہ ختم ہوا۔ صرف انداز بدل گیا۔ معمول یہ تھا کہ پابندی سے اپنے کسی عقیدت مند سے نئی کتاب پڑھواتے اور بغور سنتے تھے کتاب کے محاسن پر خوب خوب دادِ تحسین دیتے اور مصنف/مولف کے لیے کلماتِ خیر بھی۔ اگر کبھی کوئی نقص کا پہلو سامنے آتا تو ناقدانہ انداز میں نفیس علمی گفتگو فرماتے ساتھ ہی یہ بھی کہ نہ معلوم کیوں مصنف نے اس پہلو پر توجہ نہیں دی۔ (یہ میری خوش نصیبی ہے کہ

مجھے بھی اکثر یہ سعادت حاصل ہوئی ہے جو میرے لیے اضافۂ علمی کا سبب بھی بنی ہے)۔
اگر کبھی چند دن کوئی مخلص عقیدت مند حاضر نہ ہوتا تو اُس کے میسّر آنے پر اس سے فرماتے، "میاں! کہاں غائب تھے، فلاں کتاب آئی ہے ہم شدت سے منتظر ہیں کہ اُسے سنیں" اللہ اللہ۔ یہ خلوص! یہ جذبہ! شوقِ مطالعہ کی یہ فراوانی قابلِ دید ہی نہیں لائقِ رشک بھی ہے۔

استعدادِ فطری و ذہانتِ طبعی

اہلِ علم و دانش سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ توارثِ اموال کی طرح توارثِ صفات بھی مسلّم ہے۔ اکثر کاملین میں یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ ایک عرصے تک چلا ہے اور چل رہا ہے۔ اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ پسندیدہ کے مظاہر کئی پشت تک اُن کی نسل میں رہے ہیں۔ "گندم از گندم بروید جو زِ جو"۔ اسی حقیقت کے لیے دلیلِ اساسی فراہم کرتا ہے۔
سرکار مولانا اعلی اللہ مقامہ میں بچپن ہی سے اَب وجَدّ کے جمیع اوصاف وخصائل اور جملہ آثارِ کمال نمایاں تھے ؎

بالائے سرش زہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

لکھنؤ تشریف لائے تو حیران کن سرعت کے ساتھ اپنے ہم درس طلباء کے مقابل امتیازی مقام حاصل کرتے چلے گئے اور بسبب اپنی استعدادِ ارثی و ذہانتِ فطری جملہ اساتذہ کرام کی نظروں میں نہ صرف لائقِ ستائش ٹھہرے بلکہ باعثِ افتخار بھی قرار پائے۔ بہت ہی مختصر عرصے میں لکھنؤ کی علمی فضاؤں میں آپ کا چرچا ہونے لگا۔ صاحبانِ علم و دانش آپ کا ذکرِ خیر بالفاظِ تحسین و تکریم فرمانے لگے۔ آپ کی یہی استعدادِ فطری، ذہانتِ طبعی اور سیرتِ موروثی آپ کے لیے سرکار ناصر الملت حجۃ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ

اعلی اللہ مقامہٗ کی مجالس و محافل تک رسائی کا ذریعہ بنیں۔

جو ذہانت وراثتاً ملی تھی اُسے زمانے کے بے مثل و بے عدیل اساتذۂ کاملین کی علمی کاوشوں نے ایسی جِلا بخشی کہ چند سال میں آپ نے وہ کمالِ علمی حاصل کرلیا جو عام لوگ پچیس تیس سال کی کدوکاوش کے بعد بھی حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کمالِ علمی کی انتہا "قوتِ استدلال" تھی۔ جو عام حالات میں طویل مدت کے ریاض کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ وہ بھی کسی کسی میں۔

وہ ذی علم حضرات جنھیں سرکار مولانا مرحوم کے فیوضاتِ علمی سے استفادے کا موقع ملا ہے اور جنھوں نے ہر علم و فن کے متعلق آپ کے استدلالات و استنباطات کو سُنا اور دیکھا ہے اس بات کے مُقر نظر آتے ہیں کہ اپنے دور میں آپ کی ذاتِ گرامی قدر اُفقِ علم کا وہ درخشندہ آفتاب تھی جس کی ایک ایک کرن نے بے شمار قطرہائے شبنمی کو دریاؤں کی روانی عطا کی ہے۔ جس کی نورپاشیوں نے اَن گِنت زبان ہائے گنگ کو قوتِ گویائی بخش کر صاحبِ محراب و منبر بنادیا ہے۔ چونکہ "العلم امام العقل" ایک مسلمہ حقیقت ہے مسلسل مطالعہ نے خداداد حافظہ کو اس درجہ قوی کردیا کہ بیشتر تشنگانِ علوم نے اس کے حیران کُن مظاہر دیکھے اور آپ کی جلالتِ علمی و ذہانتِ طبعی کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

سرکار مولانا اعلی اللہ مقامہٗ مرحوم کی خدمت میں اپنے بھی آتے اور بیگانے بھی، اہلِ سنّت بھی آتے اور اہلِ تشیّع بھی، مسلم بھی آتے اور غیر مسلم بھی، ذی علم بھی آتے اور کم علم بھی، مجتہدین بھی آتے اور طالبانِ علم بھی، قدیم تعلیم یافتہ بھی آتے اور جدید تعلیم یافتہ بھی، فلاسفہ بھی آتے اور حکماء بھی، سائنس داں بھی آتے اور ریاضی داں بھی، مورخین بھی آتے اور معاشیات و مدنیات کے ماہرین بھی، شعراء بھی آتے اور نثار بھی۔ ہر آنے والا اپنی علمی منزلت کے اعتبار سے تعظیم و تکریم سے بھی نوازہ جاتا اور اپنے مسائل کے بارے میں بمطابقِ استعدادِ عقلی ایسے جوابات سے مستفیض ہوتا

کہ بزبانِ خامشی خود کہہ اُٹھتا" سرکار کی خدمت میں اب تک حاضر نہ ہو کر میں خسارۂ عظیم میں رہا۔"

ہم نے نہ کبھی دیکھا اور نہ کسی سے سُنا کہ سرکار مولانا مرحوم کسی سائل کے کسی سوال کے جواب سے عاجز رہے ہوں یا اُسے قابلِ اطمینان جواب نہ دیا ہو۔ دنیائے علم میں ایسے حاضر جواب متبحر کم ہی ہوئے ہیں۔

ہم اگر ایسے تعلیم یافتہ، پختہ مغز، بالبصیرت افراد کے ناموں کی فہرست پیش کریں جو آپ کی مجلس میں تشریف لایا کرتے تھے تو کئی صفحات کا مزید اضافہ ہو جائے گا اور اختصار سے بیان کی ہماری یہ کوشش بے ثمر ثابت ہوگی۔

بہرحال اُن آنے والوں میں آج بھی بہت سے ایسے حضرات موجود ہیں جو اس پر گواہ ہیں کہ اگر کسی موقع پر کسی مسئلہ کے بارے میں یا کسی روایت کے سیاق و سباق کے سلسلے میں سرکار مرحوم کی کُتبِ کثیرہ میں سے کسی کتاب سے رجوع کی ضرورت پیش آتی تو سرکار مرحوم فرماتے " فلاں الماری کے فلاں خانے میں فلاں نمبر کی کتاب نکالیے جس کی جلد اس رنگ کی ہے۔ اس کے فلاں صفحے پر سطر نمبر فلاں کو دیکھیے"۔

یہ صورت بینائی کے ضائع ہو جانے کے بعد بھی باقی رہی۔ سبحان اللہ۔ کیا حافظہ تھا اور کیا بصیرت۔ ؟

المختصر۔ استعداد موروثی، جلیل القدر اساتذہ کرام کے خزانہ ہائے علوم سے فیض یابی، اور مسلسل مطالعہ کی عادتِ خصوصی نے فقہ، اصولِ فقہ، علمِ حدیث، علمِ تفسیر، علمِ کلام، منطق، فلسفہ، علمِ مدنیات و معاشیات، علومِ طبّی و طبعی، تاریخِ اسلام و مسلمین، ادبیاتِ عربی و فارسی و اردو وغیرہ تمام علوم میں وہ مہارتِ کاملہ اور لیاقتِ تامہ عطا کی جس سے ثابت ہو گیا کہ بلاشک و شبہ سرکار مرحوم ان نفوس میں سے تھے جن کے متعلق حضراتِ صادقین علیہم السلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ " علماء وارثانِ علمِ انبیاء ہیں "۔

یقیناً ایسے ہی علماء کے بارے میں معصومؑ کا ارشاد گرامی ہے: "ہمیشہ ہمارے سلسلے میں کچھ ایسے عادل علماء رہے ہیں جو دین سے غالیوں کی تحریفات، جاہلوں کی تاویلات اور علماء نما حضرات کی مدخولات کو دور کرتے رہتے ہیں یہی دین کے سچے حامی ہیں اور انھی کو حصنِ اسلام کہا گیا ہے۔ انھی کی موت سے اسلام میں رخنہ پڑتا ہے"۔

بزرگ محترم و معظم آغا سید محمد حسنین جعفری صاحب قبلہ مرحوم و مغفور نے سرکار مولانا مرحوم و مغفور کی حیات ہی میں مختصر لفظوں میں بہترین تعارف کراتے ہوئے ان الفاظ میں اظہارِ عقیدت فرمایا ہے کہ "علم و فضل کے جو خزائن اس ذاتِ مجمعُ الصفات میں پنہاں ہیں، علوم عقلی و نقلی، فلسفہ و منطق، علمُ الادیان و علمُ البیان کے رموز و غوامض پر جو عبور مولانا ممدوح کو حاصل ہے اُس نے انھیں محبوبِ خلائق و مرجعِ عوام بنا دیا ہے"۔

جویائے علم کا جویائے کتب رہنا ایک فطری عمل ہے چنانچہ سرکار مولانا مرحوم نے میراث میں ملنے والے ذخیرۂ کتب پر قناعت نہیں کی بلکہ تمام زندگی بہترین علمی کتب کے حصول اور جمع آوری میں کوشاں رہے جو کتاب جہاں سے جس قیمت پر بھی ملی اُسے حاصل کر کے ہی سکون کا سانس لیا چنانچہ آپ کے کتب خانے میں دس ہزار سے زیادہ کتب موجود تھیں جن میں تقریباً دو ہزار نادر قلمی نسخہ جات بھی تھے۔ آپ کے فرزندِ اکبر حضرت علامہ طالب جوہری قبلہ مدظلہ العالی نے اس ارثی عمل کو جاری رکھتے ہوئے کُتب خانے میں ایک معتدبہ اضافہ کیا ہے اور آج یہ ملک کے بہترین نجی کتب خانوں میں سے ایک ہے۔

خدمت دینی و ملی

ہم درج بالا سطور میں بیان کر چکے ہیں کہ سرکار مولانا مرحوم نے علوم معصومین علیہم السلام کی نشر و تبلیغ اور احکامِ دین کی ترویج کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد قرار دیا تھا۔ چنانچہ اس مقصد

کی تکمیل کے لیے وہ تمام راہیں انتخاب و اختیار کیں جو ممکن ہو سکتی تھیں۔ تدریس و تعلیم، مواعظ و خطابت، تقریر و تحریر غرض کسی صورت اور نوعیت کو ترک نہیں کیا۔ آئندہ ہم سرکار مولانا کی ان سعی ہائے شدیدہ و بلیغہ کو انہی ذیلی عنوانات کے تحت اختصار سے پیش کریں گے۔

تعلیم و تدریس

رسمی تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ وطنِ مالوف تشریف لے آئے اور معصومؑ کے اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے کہ "ہر شئے کی زکاۃ ہے علم کی زکاۃ یہ ہے کہ اُسے اہل کی طرف منتقل کر دیا جائے" آپ نے ابتداً مدرسۂ سلیمانیہ (پٹنہ) میں فریضۂ تدریس کا آغاز کیا۔ بعدہٗ مدرسۂ عباسیہ (پٹنہ) میں صدرِ مدرّس کی حیثیت سے تشنگانِ علوم کی رفعِ تشنگی کے لیے اپنے سینے میں موجزن دریائے علم سے اَنہار کا اِجراء فرمانے لگے۔ خوش نصیب طلباء سیراب ہوئے اور خوب خوب سیراب ہوئے بعدہٗ کچھ عرصہ مدرسۂ باب العلوم (ملتان) میں بھی صدرِ مدرّس رہے۔ نیز حیدرآباد دکن کے قیام میں مدرسۂ جعفریہ میں عرصہ دراز تک انہی فرائض کی بجاآوری میں مصروف رہے۔

پاکستان تشریف لانے کے بعد یہاں کی عظیم درس گاہ کو اپنے علمی فیوضات سے مشرف فرمایا اور عرصے تک جامعۂ امامیہ کراچی میں طالبانِ علوم کے لیے غذائے علمی و روحانی کی بافراط بہم رسانی فرمائی۔

اسی دوران "خشتِ اوّل" کی اساسی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے آقائے شیخ محمد شریعت اعلی اللہ مقامہٗ مرحوم کے ساتھ ابتدائی دینی تعلیم کے انتظامات پر توجہ دی اور یوں "مدرسۂ جعفریہ" کا قیام عمل میں آیا جس کی شاخیں کراچی اور سندھ میں تھیں لیکن افرادِ قوم کی سرد مہری اور بے توجہی کے سبب یہ سلسلہ زیادہ عرصے نہ چل سکا نتیجتاً یہ مدارس

بند ہو گئے۔

مختصر اً سرکار مولانا اعلیٰ مقامہٗ مرحوم کی اس تمام کدوکاوش کا ثمر آپ کے وہ صدہا شاگرد ہیں جو برِّ صغیر پاک و ہند کے علاوہ افریقہ، ایشیا اور یورپ کے بیشتر ممالک میں تدریس و تبلیغ میں مصروف و مشغول ہیں اور سرکار مرحوم کی تمنائے قلبی کی ہنوز تکمیل فرما رہے ہیں۔

مواعظہ و خطابت

بلدۂ علم و دانش لکھنؤ کے دورانِ قیام ہی مواعظہ و خطابت کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہو چکا تھا۔ چوں کہ لکھنؤ کی راہیں بے شمار جلیل المنزلت خطباء و واعظین سے چھلک رہی تھیں سرکار مولانا مرحوم نے ابتداً وطن مالوف کے برادرانِ ایمانی کو دولت علم سے مالامال کر کے شعارِ بوذری کی طرف راغب کیا اور پھر چند سال میں کم سن و مسن، کم علم و ذی علم، حق آشنا و حق نا آشنا تمام افراد کے قلوب میں اپنے لیے وہ مقام پیدا کر لیا کہ ہر زبان آپ کی علمی جلالت کی معترف اور ہر سر آپ کے احترام میں خم ہونے لگا۔

کچھ عرصہ گزرا تھا کہ آپ کی شہرتِ علمی نے اہلِ کانپور کو آپ کی جانب متوجہ کیا۔ چنانچہ اس شہر کے مومنین کی شدید خواہش اِستفادۂ علمی کی تکمیل کے لیے یہاں تشریف لائے اور نامِ علی کے چھتے میں ایک مومنِ بے عدیل جناب رضا حسین صاحب مرحوم کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ چند سال اس شہر کے مومنینِ کرام کو اپنے مواعظہ و خطابت سے سرفراز کیا۔ کانپور کے بہت سے مومنینِ کرام جو سرکار مولانا مرحوم کے فیوضاتِ علمی سے اس دور میں مستفید ہوئے ہیں۔ آج بھی کراچی میں موجود ہیں۔ کانپور کے ان عقیدت کیش مخلصین و مومنین کے نمائندہ حیثیت میں ڈاکٹر محمد صادق صاحب قبلہ پی۔ ایچ۔ ڈی جو تقریباً پینتالیس[۴۵] چھیالیس[۴۶] سال بہ پابندی سرکار مولانا مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادۂ علمی کی سعادت سے مشرف ہوتے رہے ہیں

قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف آج بھی سرکار مولانا مرحوم کا نام سنتے ہی اظہارِ عقیدت کے طور پر گہر ہائے اشک کا نذرانہ پیش کرنے لگتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ بجز سرکار مولانا اعلی اللہ مقامہٗ مرحوم کوئی اور قدآور علمی شخصیت میں نے ایسی نہیں پائی جو کسی بھی علم کے کسی بھی موضوع سے متعلق سوال کرنے والے کو اپنے جواب شافی سے اس درجہ مطمئن کر دے کہ سائل اس موضوع پر علمی تشنگی کی اذیت سے خود کو ہمیشہ کے لیے محفوظ خیال کرنے لگے (قارئین سے معذرت خواہ ہوں کہ میں ہنوز ڈاکٹر صاحب موصوف سے سرکار مرحوم کے بارے میں وہ سب کچھ نہ لے سکا جس کے حاصل ہونے کا یقین ہے۔)

ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد کو پیشِ نظر رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرکار مولانا اعلی اللہ مقامہٗ علم و آگہی کے اس مقام پر فائز تھے جہاں علم ایک وحدت، ایک اکائی بن جاتا ہے جہاں شعبہ ہائے علم کی تمیز و تخصیص ختم ہو جاتی ہے جہاں علم ایک نقطہ نظر آتا ہے اور اس کی تقسیم کرنے والے جہلا کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

صاحبانِ عقل و دانش نے اس منزل پر فائز جلیل المرتبت افراد کو کبھی مجتہد العصر، کبھی علامۂ دوراں کبھی سیّد الحکماء وغیرہ الفاظ سے موسوم کیا ہے۔

سرکار مولانا مرحوم گو نجف کے فارغ التحصیل نہ تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد کے درجہ جلیلہ پر فائز بہت سے مجتہدینِ عراق و ایران نے آپ کی علمی عظمت کو تسلیم کر کے تحسین آمیز آرا کا اظہار فرمایا ہے اور مجتہدینِ پاک و ہند کے لیے تو آپ کی ذاتِ گرامی لائقِ صد افتخار ہی نہیں تھی بلکہ بیشتر مواقع پر استفادۂ علمی کا ایک مستقل ذریعہ بھی تھی۔

المختصر چند سال کانپور قیام فرما کر اور اہل کانپور کے لیے اپنے فیوضاتِ علمی و روحانی سے تسکینِ اشتہائے قلبی و ذہنی کے تمام تر اسباب فراہم کر کے آپ حیدر آباد (دکن) کے مومنین کی علمی تشنہ لبی کے ازالے کے لیے وہاں تشریف لے گئے (افسوس یہاں کے قیام سے متعلق حالات

معلوم نہ ہو سکے۔)

یہی زمانہ تھا کہ پاکستان معرضِ وجود میں آیا چنانچہ ۱۹۴۹ء میں آپ پاکستان تشریف لے آئے اور کراچی کو آپ کے مستقل مستقر کی سعادت حاصل ہوئی۔ ابتدا آپ مکرم و معظم رضا حسین صاحب ایڈووکیٹ دام ظلہٗ کی رہائش گاہ "رضا بلڈنگ" مولجی اسٹریٹ کھارادر میں قیام پذیر ہوئے۔ یہ قیام ۱۹۵۳ء تک رہا بعدہٗ ناظم آباد نمبر۲ میں واقع اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہو گئے۔

اس تمام عرصہ مواعظہ و خطابت کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ ابتداً دو سال (۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء) لاہور میں بزرگ محترم رضا حسین صاحب ایڈووکیٹ کے برادر معظم علی حیدر صاحب قبلہ مرحوم کے یہاں مجالسِ محترم سے خطاب فرمایا بعدہٗ تین سال (۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۳ء) ڈھاکہ چٹاگانگ کے مومنین کو آپ کے بیانِ بصیرت افروز سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا۔ اس کا سبب بھی علی حیدر صاحب قبلہ مرحوم کی ذاتِ گرامی تھی۔

بعد ازاں ۱۹۵۴ء سے ۸۳-۱۹۸۲ء تک یعنی انتقال سے تین چار سال قبل تک جناب رضا حسین صاحب ایڈووکیٹ کے دولت خانے پر (فردوس کالونی) عشرہائے مجالس سے خطاب فرماتے رہے۔

غالباً ۱۹۵۵ء سے دو تین سال مسلسل بسلسلۂ نشرِ علومِ اہلبیتؑ و ترویجِ احکامِ شریعیہ دارالسلام۔ تنزانیہ (افریقہ) تشریف لے جاتے رہے اور وہاں اس مختصر عرصۂ بیان میں وہ دیرپا اثرات چھوڑے کہ آج تک بزرگ مومنین آپ کے پُرتاثیر بیان کا اپنے عمل سے ثبوت دے رہے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں زیارتِ مقاماتِ مقدسہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف تشریف لے گئے اور یہاں بھی مجالس سے خطاب فرما کر بارگاہِ معصومین علیہم السلام سے اپنی نجاتِ اُخروی کے بلاواسطہ پروانے حاصل کیے۔

المختصر صفِ اوّل کے شیعہ خطباء و ذاکرین کی حیثیت سے آپ کے مواعظہ و خطابت کا یہ سلسلہ تقریباً نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔

اگرچہ تقریروں پر فلسفہ اور علم کلام کا رنگ غالب تھا لیکن بیان تکلفات سے عاری اور خلوص سے لبریز ہوتا تھا اور تمام تر دلکشی رکھتا تھا۔ بالخصوص اہلِ علم کے لیے ایک مستقل ذریعۂ زیادتیِ علم تھا۔ بیشتر مجالس تبلیغی ہوتی تھیں۔ جن میں پابندی سے مسائلِ شریعہ کی تشریح و توضیح نہایت سہل انداز میں فرمایا کرتے تھے۔

بقولِ بزرگِ محترم رضا حسین صاحب ایڈووکیٹ "آپ کی تقریروں سے صدہا افرادِ قومی کو اصولِ دین کے حقائق و معارف اور فروغ دین کے بنیادی تصورات و اساسی احکامات حاصل ہوئے اور ہم جیسوں نے نماز و روزہ کی درستگی آپ کے بیان ہی سے کی ہے" یہ وہ حقیقت ہے کہ سرکار مولانا مرحوم کے جملہ سامعین اس کے مقر ہیں۔ (جزاہُ اللہ خیر الجزاء)

اس جلالتِ علمی کے باوجود سادگی یہ کہ مجلس کے لیے مجمع کی قلت و کثرت سے لاپرواہ۔ ہدیہ و نذرانہ سے بے نیاز، مقصد صرف اور صرف معصومین علیہم السلام کی رضا جوئی اور منشائے حیات کی تکمیل۔

بیان پر اس درجہ قدرت کہ ایک موقع پر آپ کے ایک عزیز مسعود صاحب نے آپ سے گزارش کی "حضور! صرف پانچ منٹ بیان فرما دیجیے، آپ کا یہی بیان میرے لیے شرف کا باعث ہوگا" آپ نے فرمایا "صرف پانچ منٹ۔؟ اچھا"! یہ کہہ کر منبر پر تشریف لے گئے خطبہ کے علاوہ صرف پانچ منٹ تقریر (تین، ساڑھے تین منٹ فضائل اور ڈیڑھ منٹ مصائب) لیکن ایسی یادگار مجلس جس کا ذکر کرتے ہوئے آپ کے عقیدت کیش عزیز عالی جناب محمد یحیٰی صاحب دیز تک جھوم جھوم کر تعریف بھی کرتے رہے اور اشک افشانی بھی۔

نشرِ علوم مقصد زندگی نہیں عینِ زندگی

سرکار مولانا اعلی اللہ مقامہٗ مرحوم کی زندگی کے ایسے بے شمار واقعات ہیں جو اس اَمر پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ نشرِ علومِ محمدؐ وآلِ محمدؐ علیہم السلام اور ترویجِ احکامِ اسلام کو مقصدِ حیات ہی نہیں بلکہ عینِ حیات خیال فرماتے تھے۔ ہم ان سطور میں اسی قسم کا ایک واقعہ پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین آپ کی سیرت کے اس پہلو سے آگاہ ہوسکیں کہ آپ کا یہ ہمہ وقتی شغف وانہماک کس درجہ آپ کی زندگی کا جزوِ لاینفک بن گیا تھا۔

آپ کو کراچی تشریف لائے ہوئے چند دن ہوئے تھے ایک روز سندھ یارن سنڈیکیٹ (نیو) کے مینیجنگ ڈائریکٹر جناب جعفر علی لاکھانی صاحب (مرحوم) سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو سیٹھ صاحب نے سرکار مولانا مرحوم سے مودبانہ عرض کیا کہ "مولانا! میں کوئی ایسی صورت کرنا ہوں کہ آپ کے لیے مستقلاً آمدن کا ذریعہ ہوجائے۔" سرکار مرحوم نے جواباً جو کچھ فرمایا وہ طلائی حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ آپ نے کہا۔ "سیٹھ صاحب! اس کی فکر نہ کریں، رازق اللہ ہے۔ ہاں اس کی کوشش کیجیے کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ دوسروں تک پہنچ جائے۔ بس اس کے انتظامات فرما دیجیے۔"

سبحان اللہ۔ یہ استغناء، یہ توکل، یہ جذبۂ خدمتِ دینی و ملّی۔؟ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

سیٹھ صاحب مرحوم کے لیے یہ جواب کتنا غیر متوقع تھا اس کا اندازہ اس استعجاب سے ہوسکتا ہے جس کا اظہار آپ نے سرکار مولانا مرحوم کے ایک عزیز عالی جناب محمد یحییٰ نقوی صاحب سے کیا کہ "ہم تو مولانا کی بھلائی کی بات کرتے تھے۔ مولانا نے یہ جواب دیا"۔ حالانکہ جو کچھ سرکار نے ارشاد فرمایا تھا اسی میں حقیقی بھلائی (فلاحِ دارین) کا راز مضمر تھا۔

چنانچہ یہ انتظامات سرکار مرحوم کی اسی خواہش کی تکمیل کی صورت تھے۔

محفل جعفری (کھارادر) میں ہفتہ وار یعنی بروز شنبہ درسِ عقائد و اصولِ دین کا بندوبست۔ یہ سلسلہ کم و بیش بیس سال تک جاری رہا۔

انجمنِ خدام القرآن (کھارادر) میں ہر شب جمعہ ہفت روزہ اصلاحِ اخلاق و کردار کی نشستوں کا انعقاد۔ یہ سلسلہ بھی عرصہ دراز تک چلتا رہا۔

تابوت کمیٹی (کھارادر) میں ماہِ مبارکِ صیام میں درسِ تفسیر کا آغاز جو تقریباً بیس سال تک جاری رہا۔

بعدہٗ اپنے دولت کدہ پر ہر شب جمعہ دینی نشست کا اہتمام فرمایا جس میں بعد نمازِ مغربین حدیثِ کساء ہوتی پھر سرکار مولانا مرحوم خود مسائلِ شرعیہ وفضائلِ معصومینؑ بیان فرماتے تھے۔ آخر میں حاضرین مسائل سے متعلق سوال کرتے تھے۔ مومنین و مسلمین کی کثیر تعداد تقریباً پچیس سال تک ان نشستوں سے مستفید و مستفیض ہوتی رہی۔ کیفیت یہ تھی کہ کبھی کسی کے غلط سوال پر یا بار بار سوال کرنے پر اظہارِ ناراضگی نہ فرماتے تھے بلکہ انتہائی سادہ الفاظ میں ایسا معقول جواب مرحمت فرماتے کہ سائل مطمئن ہوکر مسکرا اٹھتا۔ برخلاف اس کے امورِ شریعہ میں اس حد تک شدید تھے کہ کسی کو خلافِ شرع یا خلافِ دین کچھ کہتے ہوئے، سنتے یا کرتے ہوئے دیکھتے تو فوراً سختی سے ٹوک دیتے۔ اس میں سنِ و سال کا بھی قطعاً لحاظ نہ فرماتے۔ حقیقتاً زبانی جہاد کی یہی بہترین صورت ہے کہ مصلحتیں ہمیں گنگ نہ کر دیں۔

تحریری خدمتِ دین

تقریری خدمت کی ان ممکنہ صورتوں کے علاوہ تحریری طریقے سے خدمتِ دین بھی اسی شد و مد سے جاری رہی۔

ابتدأً سید فرزند رضا رضوی صاحب کی ہمکاری میں ایک ادارہ "مجلس المسلمین" کے نام سے قائم کیا جس کا مقصد خط وکتابت یعنی مراسلاتی طریقے سے اور مطبوعات کے ذریعہ دینِ حقہ کی تبلیغ کرنا تھا۔ اس ادارہ کی خدمات بحمداللہ ہنوز جاری ہیں۔

اس کے علاوہ سرکار مولانا مرحوم کی وہ کتب ہیں جو باقیات الصالحات کی صورت آپ کی تحریری خدمتِ دین کا خامشی شعار بولتا ثبوت ہیں۔

تصانیف وتالیفات

۱۔ خدا کا ثبوت (مطبوعہ)
۲۔ اصولِ جعفریہ (")
۳۔ عقائد جعفریہ (")
۴۔ توحید وعدل (")
۵۔ علمِ کلام
۶۔ اجتہاد وتقلید (فارسی)
۷۔ فقہ استدلالی (عربی) نامکمل
۸۔ بعض مباحثِ رجال (عربی)
۹۔ ترجمہ "الغدیر" (جلد اوّل)
۱۰۔ تلخیص تہذیبِ اسلام (مطبوعہ)
۱۱۔ فضائلِ پنجتنؑ
۱۲۔ تفسیرِ سورۂ حمد (فارسی)
۱۳۔ تفسیرِ آیات (فارسی)
۱۴۔ ترجمہ خطبۂ فدک
۱۵۔ ترجمہ زیاراتِ معصومینؑ

سخن دانی وسخن وری

تاریخِ انسانی کے اوراق گواہ ہیں کہ ایسے افراد جو بیک وقت جمیع علوم پر دسترس، تحریر وتقریر پر بھرپور قدرت رکھتے ہوں اور نثر و نظم دونوں میدانوں کے مشاق شہسوار رہے ہوں کم ہوئے ہیں۔ بشر کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایک پہلو ناقص ونامکمل نظر آتا ہے۔ لیکن قدرت نے

سرکار مولانا مرحوم کو ان کل اوصاف سے بدرجۂ اولیٰ نوازہ تھا۔ یقیناً یہ کمال درِ معصومین علیہم السلام سے مستقل وابستگی کا نتیجہ تھا۔ آپ کو جو مقام تقریر میں حاصل ہوا، جو منزلت نثری کاوشوں سے میسّر آئی وہی درجۂ رفیعہ بسبب منفرد افتادِ طبع اور بے مثل رجحانِ فطری، نظم میں بھی حاصل ہے۔ اگرچہ اس حقیقت سے بیشتر افراد ناواقف و ناآشنا رہے ہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود سرکار مرحوم ہی نے اپنی اس خصوصیتِ شاعرانہ کو بہت کم عام ہونے دیا۔

حالانکہ بقول آغا سیّد محمد حسنین صاحب قبلہ مرحوم نوراللہ مرقدہٗ ۔" وہ ایک بلند پایہ ادیب، ایک صاحب طرز شاعر اور ایک منفرد نکتہ شناس و سخن داں ہیں۔ باوجودیکہ انھیں ہر صنفِ سخن پر قدرت حاصل ہے لیکن اُن کے جواہر خانۂ شعر میں وہ لآلیِ آب دار زیادہ نظر آتے ہیں جنھیں ولائے عترتِ اطہارؑ سے آب وتاب حاصل ہوئی ہے۔" (سرکار کی حیات میں کہے گئے الفاظ)

اس میں شک نہیں کہ سرکار مرحوم نے بے شمار اصنافِ سخن مثل غزل، مثنوی، قطعات رباعیات۔ قصائد۔ حمد و نعت۔ سلام وغیرہ میں طبیعتِ موزوں کی خوب خوب جولانیوں کا مظاہرہ فرما کر شخصیت کے اس مخصوص پہلو کو ایک الگ کتابی موضوع بنا دیا ہے لیکن آپ کی فکرِ طاہر کا واحد محور مدحتِ معصومین علیہم السلام ہی رہا ہے ایک ظاہر بین کے لیے یہ فکر کی محدودیت ہو سکتا ہے لیکن باطن بین چشمِ بصیرت کے لیے کائناتی وسعتوں کا حامل۔ کیونکہ یہی ذواتِ مقدسہ "وجہ اللہ" بھی ہیں اور وجہِ تخلیقِ ماسوااللہ بھی۔

سرکار مولانا نے اس راز سے ان لفظوں میں خود ہی پردہ اُٹھایا ہے آپ فرماتے ہیں کہ" ارشادِ معصومؑ کی بنا پر۔" مَنْ قَالَ فِينَا بَيْتاً بَنَى اللّٰهُ لَهُ بَيْتاً فِی الْجَنَّة" میں نے بھی مداحانِ سلف کی پیروی میں اپنے لیے جنّت میں کچھ گھر بنوا لیے ہیں۔"

آپ نے شاعری کا آغاز کب کیا؟ یہ سوال اپنے جواب کے لیے ہنوز کربِ انتظار سے

دوچار ہے۔ تحقیقی طور پر اتنا معلوم ہوسکا کہ دورانِ قیامِ لکھنؤ یعنی زمانۂ طالب علمی ہی میں قصیدہ گوئی میں آپ کو وہ شہرت حاصل ہو چکی تھی کہ سرکار ناصر الملّت حجتہ الاسلام مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ مرحوم نوراللہ مرقدہٗ کے دولت خانے پر منعقد ہونے والی تیرہ رجب کی سالانہ محافل میں آپ کو صفِ اوّل کے شعراء کے مساوی مقام حاصل تھا اور آپ کے قصائد سامعین سے خوب خوب دادِ تحسین وصول کرتے تھے۔ یہی صورت پٹنہ میں مدرسۂ سلیمانیہ اور مدرسۂ عباسیہ کی محافل میں رہی۔ کراچی میں بھی مخصوص منقبتی محافل میں آپ کا کلام علماء کرام کے لیے دعوتِ فکر، شعرائے عظام کے لیے قابلِ رشک اور سامعینِ ذوی الاحترام کے لیے غذائے روح کا مستقل ذریعہ تھا۔

مختصر یہ کہ ہر محفل میں قصیدہ کا میدان آپ کے پائے نام تھا۔ یہ قصائد مستقبلِ قریب میں (انشاءاللہ) منظرِ عام پر آرہے ہیں۔

سرکار مرحوم کے کچھ سلام مطبوعہ صورت میں موجود ہیں اور عرصہ دراز سے قبولِ عام کا مقام حاصل کیے ہوئے ہیں۔

ہم آپ کی شاعری کے ضمن میں درجہ بالا سطور پر ہی اکتفا کر رہے ہیں اور اس پہلو کو عمداً تشنہ چھوڑ رہے ہیں کیونکہ اس کے ازالے کا بندوبست سرکار مرحوم کے قصائد اور دیگر غیر مطبوعہ کلام کی طباعت سے منسلک و مربوط ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ علمی و عروضی نقائص سے پاک آپ کے کلام کا یہ مجموعہ عصرِ حاضر کے بہترین ناقدین کی آرا سے مزین ہوگا اور آپ کی شاعری کے کل محاسن کو منکشف کرے گا۔

ہم صرف ایک نعتیہ شعر تبرکاً پیش کر رہے ہیں ؎

زمانے میں ہر شے سے بالا محمدؐ
تبارک محمدؐ تعالیٰ محمدؐ

سیرت کے مخصوص وصف

سرکار مولانا مرحوم اعلی اللہ مقامہ ایک عالم باعمل تھے بلکہ آپ کا علم اور عمل دونوں ہی درجۂ کمال پر تھے۔ اس کمال کی نوعیت یہ تھی کہ ہر سانس بجز حصولِ رضائے الٰہی اور خوشنودئ معصومینؑ کچھ مقصود نہ تھا۔ زبان کھولتے تو احکامِ شریعہ کی تبلیغ اور اعمالِ خیر کی طرف متوجہ کرنے کے لیے قدم اُٹھتا تو تعلیماتِ دین کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے۔

آپ مزاجاً ہر قسم کے تصنّع سے پاک، سادگی شعار تھے۔ خوش طبعی اور خوش خلقی اس درجہ کہ دل ہی نہ کھنچتے تھے بلکہ سر بھی جھکتے تھے لیکن احکامِ اسلامی کی طرف عملی دعوت دینے میں نرمی کے ساتھ شدید گرمی کا مظاہرہ کرتے اور کسی قسم کی رو رعایت نہ فرماتے۔

مختصراً آپ کی ذاتِ گرامی قولی اور عملی ہر اعتبار سے تعلیماتِ معصومینؑ کا بہترین نمونہ تھی۔ آپ کی سیرت کے بعض مخصوص پہلو یہ ہیں۔

(۱) **اطاعت و محبّت والدین** سرکار مولانا مرحوم کی سیرت کا یہ وہ وصف ہے جس کی جلوہ فرمائی تا زندگی آپ کے کردار میں نظر آتی ہے۔ یہ قدر جو مشرقی تمدن کا طرۂ امتیاز تھی اگرچہ آج دم توڑ رہی ہے لیکن بلاشبہ تعلیماتِ اسلامی کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔

سرکار مولانا مرحوم کی اطاعت و محبتِ والدین مثالی تھی آپ ابتدا ہی سے سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ اور ۲۴ میں اطاعتِ والدین سے متعلق احکامات کا ایک مکمل عملی نمونہ تھے۔ آپ کے والد ماجد حکیم صاحب قبلہ مرحوم بسبب زیادتیِ عقل و فراست ہر قسم کے جذبات پر غلبہ رکھتے تھے اور مغلوب الغضب نہ تھے لیکن بوجہ حرارت طبعی اور فطری گرم مزاجی کبھی کبھی انتہائی غیض و غضب کا مظاہرہ بھی فرماتے تھے اگر اس کا مورد سرکار مولانا مرحوم کی ذات

ہوتی تو دیکھنے والے آپ کو ایک اطاعت گزار فرزند کی طرح سرخم کیے ایستادہ پاتے آپ نے والدین کے حضور سخت سے سخت مرحلے پر بھی کبھی اُف نہیں کیا اور اُن کی حیات میں فرماں برداری کا قابلِ تحسین اور لائقِ فخر مثالی مظاہرہ فرما کر اپنے دامن کو اُن کی دعاؤں سے خوب خوب لبریز کیا۔ حد یہ ہے کہ والد مرحوم کے لیے جو حقّے کے عادی تھے خود حقّہ بھر کر پیش کرنا آپ اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے۔

اس محبت و سعادت مندی کی انتہا یہ ہے کہ سرکار مرحوم دیگر امورِ خیر کے علاوہ تابقائے ہوش روزانہ والدین کے لیے عملِ عاشور کرتے رہے اور اس میں اس درجہ مداومت تھی کہ موسم کی شدّت، ناسازیٔ طبیعت۔ فرائض متعلقہ کی کثرت۔ کوئی شے بھی سدِ راہ ہو کر اُس کے ترک کا سبب نہ بنتی۔ خود فرماتے تھے کہ۔ "میرے لیے اس عمل کا ترک ممکن نہیں۔ اگر میں اپنے لیے کرتا تو کبھی ترک بھی کر دیتا یہ تو میں والدین کے لیے کرتا ہوں پھر کس طرح ترک کر سکتا ہوں"۔

(ب) **اقربا کے ساتھ حسنِ سلوک** سرکار مولانا مرحوم نے تا زندگی اقرباء اور اعزاء کے حقوق کی کما حقہٗ پاسداری کی اور اُن کی ادائیگی کی طرف سے کبھی عدم توجہی یا بے پرواہی نہیں برتی۔ حسنِ سلوک کا یہی انداز احباب کے ساتھ بھی تھا۔ ہر ایک کے مسائل میں خود عملاً شرکت فرماتے۔ کسی عزیز یا دوست کے یہاں کوئی تقریب ہوتی تو بے تکلفانہ انداز میں شرکت فرماتے، بیشتر موقعوں پر آمد و رفت کے لیے صاحبِ تقریب پر سواری کے اہتمام کا بار بھی نہیں ڈالتے تھے بلکہ خود تشریف لے جاتے۔ وقتِ ضرورت اعزاء و احباب کی استطاعت سے بڑھ کر مالی اعانت بھی فرماتے تھے اور اعانت کر کے اس طرح بھول جاتے گویا کچھ کیا ہی نہ تھا۔

مختصراً آپ کے تعلقات ہر قسم کے تصنّع سے پاک اور خلوص سے پُر تھے۔

(ج) مومنین کی حاجت روائی واعانت

اعزاء واحباب کے علاوہ دیگر مومنین کی حاجت روائی آپ کی زندگی کا ایک معمول تھا اور اس فریضہ کی ادائیگی میں بھی آپ کی ذاتِ گرامی تعلیماتِ اسلامی کا بہترین نمونہ تھی۔

سرکار مولانا مرحوم نے اس کے لیے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ نہ صرف نرالا اور منفرد تھا بلکہ اس طریقہ پر شدت سے عمل کا انداز بھی محیر العقل تھا۔

طریقہ یہ تھا کہ سرکار مولانا اعلی اللہ مقامہٗ نے ایک کاپی (ڈائری نما) تیار فرمائی تھی اس کے ہر صفحے پر کسی ایک مستحق مومن یا مومنہ کا نام تحریر تھا۔ جب بھی کوئی صاحب استطاعت برادر مومن مجلس یا عقد یا کسی اور سلسلے سے سرکار کو کچھ پیش کرتا تو مکان پہنچ کر وہ کاپی کھولتے۔ جو صفحہ نکلتا اسی میں پیش کردہ لفافہ رکھ دیتے اور پھر اس رقم کے استعمال کو اپنے لیے قطعاً ناجائز خیال فرماتے اور جلد کسی معتبر ذریعہ سے وہ لفافہ اس حاجت مند مومن یا مومنہ تک پہنچانے کا بندوبست کرتے لیکن اس طرح کہ ذریعہ کو بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ کیا لے جا رہا ہے۔

یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ چند مواقع پر ایسی حیران کن صورت بھی دیکھنے میں آئی جو آپ کے کردار کی عظمت پر روشن دلیل ہے ہوا یوں کہ کبھی آپ عقد یا مجلس پڑھ کر مکان تشریف لاتے اور آتے ہی حسبِ معمول لفافہ جیب سے نکال کر کاپی میں رکھ دیا۔ ابھی لباس تبدیل کر کے بیٹھے ہی تھے کہ آپ کے فرزندِ اصغر یا کسی اور بچے نے اندر سے آکر عرض کیا کہ فلاں اشد ضرورت کے لیے پیسے چاہیئے اتنی رقم دے دیجیے۔ تو جواباً فرمایا کہ اس وقت میرے پاس یہ رقم نہیں ہے۔ جب کہا گیا کہ آپ ابھی مجلس یا عقد پڑھ کر آرہے ہیں یقیناً بانیِ مجلس یا صاحبِ عقد نے کچھ نذرانہ ضرور پیش کیا ہوگا تو فرماتے "اس پر اب میرا حق نہیں وہ میرے پاس کسی کی امانت ہے۔ میں امانت میں خیانت نہیں کر سکتا"۔

ھدیہ ہے کہ بطور قرض بھی اس رقم کو کاپی سے نکال کر اپنے یا اہل خانہ کے مصرف میں نہ لاتے تھے۔ اللہ رے احتیاط۔!

خاموش اعانت کا یہ سلسلہ تازندگی جاری رہا۔

مومنین کی تکلیف اور پریشانی کو سُن کر خود بھی اس درجہ مضطرب ہوجاتے کہ یوں محسوس ہوتا گویا یہ تکلیف یا پریشانی خود آپ کو لاحق ہے۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ قارئین کے لیے پیش کرتا ہوں۔

ایک دن تقریبًا ساڑھے گیارہ بجے میں سرکار مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ تنہا تھے۔ میرے پہنچتے ہی جواب سلام اور دریافتِ حالات کے بعد فرمایا۔

" میاں تم خوب آگئے۔ ابھی ایک بندہ مؤمن کا خط آیا ہے وہ عرصے سے سخت بیمار ہیں اس لفافے کو کھول کر اُن کا خط تو سناؤ معلوم تو ہو کہ اب مزاج کیسا ہے "

(اس مردِ مومن مرحوم نے دینِ باطل کو ترک کر کے دینِ حقہ کو قبول کیا تھا)

میں نے تعمیل حکم میں خط کھولا پڑھ کر سُنانا شروع کیا وہ مومن مرحوم اوجھا سینی ٹوریم میں داخل تھے زندگی سے قطعی مایوس، کیونکہ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ سرکار مولانا اعلی اللہ مقامہٗ سے دعا کی گزارش کی تھی۔ اس کے بعد اپنے اہل وعیال کے بارے میں چند جملے تھے جن کو بغیر غذا کے دو وقت گزر چکے تھے۔ جس وقت میں نے خط کی ان سطور کو پڑھا تو سرکار مرحوم قدرے بلند آواز سے گریہ فرما ہوئے۔ خود میں بھی اشک بار ہوگیا۔

میں نے آپ کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ سرکار کے یہ آنسو اس مردِ مومن کی دردانگیز حالت اور بے چارگی پر بہ رہے ہیں یا قوم کی بے حسی اور غفلت کے احساس سے؟

(د) طہارت

سرکار مولانا طہارتِ فکری و قلبی کی طرح نہایت درجہ نظافت پسند اور ظاہری طہارت کے بھی پابند اور عامل تھے، مگر آپ کی طہارت توہم پرست ملاؤں جیسی خود ساختہ نہ تھی بلکہ حدودِ شریعہ میں ایسے اعلیٰ اصول پر کہ کسی کو گراں گزرنا تو کجا معلوم و محسوس بھی نہ ہوتا تھا۔

سرکار مولانا کی اولاد

سرکار مولانا مرحوم نے تین عقد فرمائے تھے: پہلی اہلیہ سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کے انتقال کے بعد عقد ثانی فرمایا آپ کے بطن سے ایک دختر بحمد للہ حیات ہیں اور مارٹن روڈ کراچی میں قیام پذیر ہیں۔ دوسری اہلیہ کے انتقال کے بعد اپنے عمِ محترم محمد رضا صاحب مرحوم کی دختر سے عقدِ ثالث فرمایا جو بحمد للہ حیات ہیں۔ آپ کے دونوں فرزند حجۃ الاسلام حضرت علامہ ابو طالب جوہری صاحب قبلہ مدظلہ العالی اور ابوالقاسم صاحب سلمہٗ آپ ہی سے ہیں۔ سرکار علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ ہر اعتبار سے سرکار مولانا اعلی اللہ مقامہٗ کی نیابتِ حقیقیہ فرما رہے ہیں۔ آپ اپنی جلالتِ علم کے سبب دنیائے اسلام میں جس مقامِ ارفع پر فائز ہیں اُسے کسی لفظی تعارف کی احتیاج نہیں۔ ابوالقاسم جوہری صاحب سلمہٗ ایک سرکاری محکمہ میں فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔

ہماری دُعا ہے کہ پروردگار دونوں حضرات کو والدہ ماجدہ کے سایہ عاطفت میں کامران و شادمان رکھے اور سرکار مولانا مرحوم کے جمیع کمالات و اوصاف کے ظہور کا ذریعہ قرار دے (آمین)

وفاتِ حسرت آیات

صبح دم طائرانِ خوش الحان   پڑھتے ہیں "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ"

سرکار مولانا محمد مصطفیٰ جوہر صاحب اعلی اللہ مقامہٗ فی اعلیٰ علیین نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۵ء

بروز جمعرات تقریباً ۹ بج کر ۴۰ منٹ پر اس عالمِ فنا سے دارِ بقا کی طرف رحلت فرمائی اور یوں بارگاہِ معصومین علیہم السلام میں حاضری کے شرف سے مشرف ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

عرصے سے علیل تھے انتقال سے دو دن قبل تمام اہلِ خانہ کو نصائح فرمائیں۔ دیگر اعزا اور احباب کو سلام پہنچانے کی خصوصی ہدایات کیں۔ وصیت فرما کر ایسا سکوت اختیار کیا کہ آج تک آواز سننے کو ترس رہے ہیں۔

دوسرے دن انتقال فرمایا۔ محفلِ مرتضیٰ (کراچی) میں دو بجے شب غسل دیا گیا۔ صبح سرکار مولانا مرحوم کی وصیت کے مطابق آپ کا جنازہ پہلے نارتھ ناظم آباد میں واقع آپ کے مکان میں لایا گیا اور اس کمرے میں جہاں سرکار مرحوم کی کتابیں تھیں رکھا گیا۔ بعدہٗ جنازہ رضویہ امام بارگاہ لایا گیا نمازِ جنازہ یہیں ہوئی، نماز سے قبل مختصر مجلس ہوئی جسکو مولانا باقر حسنین صاحب قبلہ نے خطاب فرمایا۔ مآل کے اعتبار سے یادگار مجلس تھی۔ بعدہٗ نماز جنازہ ادا کی گئی نماز کی امامت حجتہ السلام حضرت مولانا محمد محسن نقوی صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے کی۔

نماز جنازہ میں مختلف مکاتبِ فکر کے ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ مجمع کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ جنازہ کا تابوت چورنگی تک کاندھوں پر لایا گیا پھر بھی لوگوں کی کثیر تعداد مقتضی تھی کہ جنازہ قبرستان تک یوں ہی لے جایا جائے لیکن فاصلے کا احساس، ضعیف العمر حضرات کی زحمت اور تدفین میں تاخیر کا تصور سدِ راہ ہوتے۔

میت سخی حسن قبرستان پہنچی۔ رضویہ امام بارگاہ سے قبرستان تک جو دلدوز و دلخراش مناظر دیکھنے میں آئے ان کے بیان کی ہنوز تاب و تواں نہیں۔ پہلے قبر میں حدیثِ کساء کی تلاوت کی گئی بعدہٗ سرکار مولانا مرحوم کو سپردِ قبر کیا گیا اور یوں یہ منارۂ ہدایت اور منبعِ علم ہمیشہ کے لیے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

مگر نہیں۔ ! ٹھہریے ! جس طرح علم کو فنا نہیں وہ باقی ہے اُسی طرح حقیقی صاحبِ علم

کو کبھی فنا نہیں وہ باقی رہتا ہے۔ سرکار مرحوم آج بھی زندہ ہیں۔ مومنین و مخلصین کے اذکار و افکار میں زندہ ہیں معصومین علیہم السلام کی بارگاہ میں زندہ ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ طالب جوہری مدظلہ العالی کے پیکر میں زندہ ہیں۔

جو علم و دانش و دیں کا یہاں بجھا ہے چراغ
وہی بہشت کے اک طاق میں سجا ہے چراغ
کمال اب یہ سکوں ہے کہ صورتِ طالب
اسی گھرانے میں ایک اور جل رہا ہے چراغ

(حسن اکبر کمال)

سطورِ ذیل گو تعارفِ بالا کا حصہ نہیں لیکن تقاضۂ محسن شناسی نیز فریضۂ اظہارِ تشکر کے لیے جو شرافتِ انسانی کا مسلّمہ وصف ہے میری اخلاقی مجبوری ہیں۔

میں ان اختتامی سطور میں بالخصوص بزرگ محترم آغا سید قمر حسنین صاحب قبلہ کی خدمت میں، جو اس امر کے محرک بھی ہیں اور اس تحریر کے وجود میں آنے کا باعث بھی، سپاس گزار ہوں اور باصمیمِ قلب و خلوصِ نیت ممنونیت و تشکر پیش کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ ناچیز کو اہل قرار دیتے ہوئے اس خدمتِ جلیلہ کے لیے منتخب فرمایا۔

آغا صاحب موصوف بسبب کثیر خدماتِ دینی و ملّی حلقۂ مومنین میں کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن آپ کا عظیم کارنامہ " مولانا محمد مصطفیٰ جوہر ٹرسٹ " کا قیام ہے چنانچہ آپ نے اس ادارے کے تحت اب تک بے شمار کارہائے نمایاں کی بجا آوری فرمائی ہے ان میں بہت سی کتب کی طباعت و اشاعت جو آپ کے لیے باقیات الصالحات کی صورت اجرِ عظیم کا مسلسل ذریعہ ہیں، قابل ذکر بھی ہے، اور لائقِ تحسین بھی۔

الحمدللہ! آغا صاحب موصوف کی یہ کوششیں جاری ہیں۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہماری دُعا ہے کہ خدائے حی وقیوم آپ کو صحتِ روحی وذہنی کے ساتھ صحتِ جسمی عطا فرمائے نیز آپ اور آپ کے جملہ متعلقین کو ہر دم و ہر گام شادمان و کامران رکھے۔ (آمین)

علاوہ ازیں میں اپنے لائقِ صد احترام رفیق و محسن حجۃ الاسلام حضرت علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ کا بھی ممنون و متشکر ہوں کہ آپ نے آغا صاحب کے انتخاب کو 'صاد' ہی نہیں فرمایا بلکہ ہر مرحلے پر میری معاونت و رہ نمائی بھی کی۔

نیز میں سرکار مولانا مرحوم اعلی اللہ مقامہٗ کے ان تمام مخلصین و معتقدین کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنے گراں بہا وقت کا ایک بڑا حصہ میرے لیے وقف فرما کر ہر طرح کے تعاون سے نوازا اور جملہ معلومات مرحمت کیں۔

آخر میں (THOUGH LAST BUT NOT LEAST) میں محترم اسیر فیض آبادی صاحب کی ہمت اور تگ و دَو کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنی مسلسل "دستک" سے مجھے نہ صرف بیدار رکھا بلکہ ہر طرح مستعد و متحرک بھی اور یوں آپ کی کوششوں اور یاددہانیوں نے مجھ سے یہ سطور لکھوائیں۔

وَالحمدللہ رَبّ العَالَمِینَ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلامُ عَلیٰ سَیّدِالنبین۔

تقی ہادی نقوی

عفی عنہ

مقدمہ

ڈاکٹر آغا سہیل
پروفیسر و صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور

اردو میں صنفِ مرثیہ ہمیشہ سے واقعۂ کربلا سے مختص رہی ہے جنوبی ہند میں دو سو سال تک اس صنف میں ہیئتی تجربے ہوتے رہے۔ شمالی ہند میں بھی تاریخی اور معاشرتی تغیرات کا اثر اس صنف پر مختلف زاویوں سے مرتب ہوتا رہا حتیٰ کہ اردو نظم گوئی کے مختلف مناہج کو دبستانِ لکھنؤ کے ترقی یافتہ مرثیے نے نئے نئے امکانات سے روشناس کرایا اور اردو نظم کو جس مقام تک انہوں نے پہنچایا اس میں لفظی اور معنوی خوبیاں بھری ہیں۔ اگر بغور دیکھئے تو اس میں سارا کمال اس تکنیک کا ہے جو صنفِ مرثیہ کا آزمودہ طرزِ تجربہ ہے۔

عربی اور فارسی میں تو شخصی مرثیے اپنے سماجی پس منظر اور قبائلی روایات کے مطابق مرتب تھے کہ قبیلے کا کوئی سردار یا ہیرو مر جاتا تو وصفِ میت کے طور پر اس کے کارنامے بیان ہوتے یعنی اس کے عزیز و اقارب جمع ہوتے اور قبیلے کا شاعر اس کے اوصافِ حمیدہ بیان کرتا۔ اہلِ ایران قبیلوں میں اس طرح بٹے ہوئے نہ تھے جیسے اہلِ عرب تھے کیونکہ ایران میں بادشاہت اور مرکزیت کا تسلسل قائم تھا اور اس سوسائٹی میں قبائلی اور سرداری نظام کے بجائے اجتماعی لحاظ سے ایک قومی تصور موجود تھا۔ یعنی شاہِ وقت سے وفاداری نے ایک منضبط قوم کا تصور ابھار رکھا تھا چنانچہ بعض طویل نظموں میں جہاں ہیرو کی شجاعت بہادری ملک اور قوم سے اس کی وفاداری کا بیان آتا ہے وہیں اس کے سانحۂ ارتحال پر اس کے

اوصاف بیان ہوتے ہیں جیسے فردوسی کے شاہ نامے میں سہراب جیسے جواں سال خوبصورت وجیہہ وشکیل بہادر و شجیع بیٹے کے مرنے پر اس کی ماں جس طرح بین کرتی ہے وہی بجائے خود اس کا مرثیہ ہے اور شخصی مرثیے کے ذیل میں بآسانی اُسے رکھا جا سکتا ہے تاہم یہ بھی براہِ راست اظہار نہیں ہے براہِ راست اور فطری اظہار نہیں تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔ قبیلوں کے ہیرو کی موت پر قبیلے کے شاعر کے اظہار سے یہ ضرورت بدرجۂ احسن پوری نہیں ہوتی کہ وہ اپنی قوم اور قبیلے کے جذبات کی ترجمانی ضرور کرتا ہے لیکن یہ اس کے ذاتی اور نجی جذبات اور احساسات نہیں ہوتے جب تک کسی کا عزیز قریب موت کے سانحے سے دوچار نہ ہوا ہو اور اس کے دل پر چوٹ نہ پڑے آنسو نہیں نکلتے اور رقتِ قلب پیدا نہیں ہوتی۔ چنانچہ اردو کے وہ شخصی مرثیے جن کی تعداد کم ہے بلکہ بہت ہی کم ہے کہ انگلیوں پر ایسے مرثیوں کو گنا جاسکتا ہے لیکن جو ہیں اور جس قدر ہیں سچے اور کھرے جذبات سے مملو ہیں اس لیے ان کی تاثیر میں کمی نہیں ہے غالب نے عارف کا مرثیہ لکھا حالی نے غالب کا اقبال نے داغ کا، حالی کا صفی نے شبلی نے اپنے بھائی کا علامہ اقبال نے والدہ مرحومہ کی یاد میں مرثیہ کہا۔

صفی لکھنوی نے اپنے بھائی ظریف لکھنوی کا مرثیہ کہا تو ایک روایت بنی، صفی کے مذکورہ مرثیے کا ایک شعر تو اہلِ لکھنو کے وردِ زبان ہو گیا ؎

جو اُٹھ نہ سکتا تھا خود اکیلا وہ شورِ محشر اُٹھا کے اُٹھا
ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رُلا کے اُٹھا

اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے دلی اور لکھنؤ میں اکثر شخصی مرثیے لکھے گئے نسیم امروہوی نے ابتداً ناصر الملۃ کا مرثیہ لکھا، پھر آخر آخر جوش کا مرثیہ اور اس طرح آج تک برصغیر میں یہ سلسلہ کسی نہ کسی عنوان سے جاری ہے۔

اوپر جس جگہ شخصی مرثیے کے حوالے سے یہ بات عرض کی گئی کہ اس کا ایک موثر ذاتی حوالہ قائم ہوتا ہے اور اس کے براہِ راست اظہار سے رثا رکی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس جگہ یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ شخصی مرثیے میں بھی شاعر کی ذات کو ماحول زمانے اور وقت کے سیاق و سباق سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا، تاریخی معاشرتی اور عمرانی عوامل شاعر کے دل و دماغ پر بہر حال اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور اس کی متخیلہ کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ شاعر کی ذاتی نفسیاتی اور محض نجی زندگی شخصی مرثیے میں محسوب نہیں ہوتی اس کی ذات کے جملہ دوائر اس کے فن میں جگہ بناتے رہتے ہیں کبھی شعوری طور پر اور کبھی لاشعوری طور پر اس کی قوت متخیلہ کو برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔

غالب نے زین العابدین عارف کا جو مرثیہ لکھا تو اس میں غالب کی ذاتی محرومیاں دکھ درد اور آلام بھی موجود ہیں ، لاولدی کا غم بھی ہے جوان کے متبنّٰی کی جواں مرگی کا کربناک المیہ بھی ہے۔ سابق میں اپنی تمام اولاد کے سانحاتِ ارتحال کے صدمات بھی ہیں اپنے ماحول اپنے اعزا، اور حلقۂ احباب کے احساسات اور جذبات بھی ہیں نیز اردو شعر و شاعری کے بعض روایات بھی۔ اسی طرح حالی نے غالب کے مرثیے میں ذاتی محرومیوں کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی بساط کو بھی سمیٹ کر معاشرے کی اجتماعی محرومی کا ذکر بھی کیا اور معاشرے کے اجتماعی غم کا اظہار بھی کیا اور علم و ادب کی دنیا میں غالب کے قد و قامت کا تعین بھی کیا مذکورہ بالا دونوں مرثیوں میں محض احساسات اور جذبات پر متخیلہ کی اساس نہیں ہے تفکر و تعقل پر بھی ہے۔ داغ کے مرثیے میں بھی کم و بیش یہی صورتِ حال ہے لیکن شبلی کے مرثیے میں اور خود علامہ اقبال نے والدہ مرحومہ کی یاد میں جو مراثی لکھے ہیں وہ ذاتی اور نجی غم کی تفاسیر ہیں صفی نے ظریف کا جو مرثیہ لکھا وہ ذاتی اور نجی بھی ہے اور علم و ادب کے ایک مخصوص گوشے کے ویران ہو جانے کا احساس بھی دلاتا ہے۔ البتہ نسیم امروہوی

نے ناصر الملتہ کا جو مرثیہ رقم کیا اس میں ناصر الملتہ کی علمی وجاہت، حکمت و تدبر کی ثقاہت کے حوالے سے شاعر کے ذاتی عقائد و مسلمات پر روشنی پڑتی ہے۔ آل رضا اور جوش کے جو مرثیے نسیم نے لکھے ان میں دونوں کی وجاہتِ علمی اور شاعرانہ حیثیت اُجاگر ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں بھی متخیلہ کی اساس فکر اور عقل پر قائم رہتی ہے۔ معاشرتی محرکات میں تہذیبی اور ثقافتی عناصر بھی کام کرتے ہیں بعض تہذیبیں اور ثقافتیں مقامی رنگ سے گہرا رشتہ رکھتی ہیں اور بعض مقامی اثرات کو کم قبول کرتی ہیں جو مقامی اثرات کے بجائے مابعد الطبیعات اور خصوصاً اسلامی مابعد الطبیعات سے رجوع رہتے ہیں ان کی سائیکی اور متخیلہ کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے اس موضوع پر آگے چل کر گفتگو ہونے والی ہے۔ بعض رسوم و رواج جن کا تہذیب اور ثقافت سے تعلق ہوتا ہے شاعر کی متخیلہ پر اپنی چھوٹ ڈالتے ہیں تو ان کے پرتو سے رنگا رنگ کیفیتیں جھلکتی ہیں۔ جو شخصی مرثیے کو بھی متاثر کرتی ہیں مثلاً غالب اگر الفاظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا کر پیش کرتے ہیں تو ان کے ہر شعر میں معانی اور مفاہیم کا ہیولیٰ پہلے قائم ہوتا ہے اور الفاظ اس کے تابع ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کی متخیلہ میں فکر اور عقل، اساس بنتی ہے لہٰذا منطقی استدلال کو بروئے کار لاتے ہیں۔

ع تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

چنانچہ غالب اور اقبال کے نظامِ تفکر و تعقل میں لفظ و معنی کا رشتہ تنزیہی ہے جوش ملیح آبادی کی امیجری میں ہر چند کہ تفکر و تعقل کا نظام موجود ہے لیکن لفظ و معنی کے باہم ربط میں تجسیمی کیفیت پائی جاتی ہے جو ایک تہذیبی اور ثقافتی متحرک فعال اور زندہ اجتماعی زندگی کا پتہ دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ مذکورۂ بالا تینوں شعرا ذہناً اور اساساً قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے مابین فاصلہ رکھتے ہیں اور اسی فاصلے کے سبب اپنی اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ موخر الذکر کا کوئی شخصی مرثیہ راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔

مجاز اور مصطفیٰ زیدی کے بارے میں جو چند اشعار کی نظمیں ملتی ہیں۔ انھیں مرثیہ کہنے میں تامل ہے۔ اس قماش کی رثائی نظموں کی اردو شاعری میں کمی نہیں ہے۔ لیکن اگر بفرضِ محال جوشؔ نے کوئی مرتب شخصی مرثیہ کہا بھی ہوگا تو مذکورہ اوصاف کے سبب اختصار سے کام لیا ہوگا لیکن اپنے بیان کو وسعت دینے کے لیے تجسیمی امیجری سے فن کاری دکھائی ہوگی اس مختصر تمہید کا حاصل یہ ہے کہ شخصی مرثیے میں قصیدے کے ممدوح کی طرح ممدوح کی شخصیت میں وجاہت اولوالعزمی بلند کرداری شان وشوکت اور وقار لازمی ہے۔ جس ممدوح کی شخصیت وقیع ہوگی اور اس شخصیت کو اپنے فن کی قوت سے شاعر اُبھارنے میں کام یاب ہوگا اسی قدر شخصی مرثیے میں زور پیدا ہوگا۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ شخصی مرثیے کی شخصیت اگر صرف شاعر کے لیے معزز و محترم ممتاز اور وقیع ہے اور وہ کسی طرح بھی مرجع خلائق نہیں ہے تو شاعر خواہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دے۔ مرثیے میں زور اور اس کی فن کاری میں خوبی پیدا نہیں ہوسکتی یا اگر شخصیت کا دائرۂ اثر حلقہ، مرجعیت محدود اور مسدود ہے تو خواہ شاعر اُسے ساتویں آسمان پر کیوں نہ بٹھا دے اس کا اثر بہرحال محدود ہوگا تاہم یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر اگر خود وقیع اور ممتاز مقام رکھتا ہے تو اس کے حوالے سے شخص مذکور جس کا مرثیہ کہا جارہا ہے۔ وقیع مقام حاصل کرلیتا ہے۔ زین العابدین عارفؔ غالب کے حوالے سے مذکورہ مرثیے میں زیادہ اہم بنے، شبلی کے حوالے سے اُن کے بھائی زیادہ اہم بنے۔ وقس علیٰ ہذا۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے درمیان بڑا طویل فاصلہ موجود ہے اور اس فاصلے کی تاریخ بھی کئی لحاظ سے اہم ہے کہ تاریخ بدلنے سے محض تاریخ نہیں بدلتی بلکہ معاشرتی اقدار بدل جاتے ہیں۔ عمرانی مزاج اور مذاق بدل جاتا ہے کبھی تخریب کے پردے میں تعمیر اور کبھی تعمیر کے پردے میں تخریب رونما ہوتی ہے مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی

نے ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی حکومت کا خاتمہ کر کے ایک نئے صنعتی نظام کی بساط بچھانا شروع کی تو مغلوں کے فرسودہ جاگیردارانہ نظام کی بساط خود بخود لپٹنا شروع ہوگئی اور جب غالب نے ۲۶ - ۱۸۲۵ء میں بنگالے میں قدم رکھا تو ایک ورق الٹ چکا تھا، کلکتے کی معاشرتی، صنعتی اور تہذیبی زندگی کی کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عزائم اچھے نہ تھے وہ برطانیہ کے استعماری اور سامراجی نظام کی بنیادیں قائم کر رہی تھی مقامی صنعتوں کا استحصال کر رہی تھی ملک و قوم کو نقصان پہنچا رہی تھی لیکن اس تخریب کے پردے میں تعمیر کے بھی کچھ نہ کچھ پہلو نکل رہے تھے یعنی مغلوں کے جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے ساتھ نیا تجارتی اور صنعتی نظام جلوہ گر ہو رہا تھا، سڑکیں کشادہ ہو رہی تھیں، بادبانی کشتیوں کی جگہ دخانی کشتیاں چل رہی تھیں، باغات کی جگہ پارک بن رہے تھے ان تمام باتوں نے غالب کے ذہنی افق کو بدلنا شروع کیا اور وہ سید احمد خاں کی مشہورِ زمانہ کتاب کے موضوع، اسلوب اور نفسِ مضمون کو فرسودہ اور از کار رفتہ سمجھنے پر مجبور ہوئے گویا شاعر اور ادیب کی سوچ اور فکر کے بدلنے سے ادب کا اور ادب کی تخلیق کا سیاق و سباق بھی بدل جاتا ہے۔ غالب کے تفکر و تعقل کے کیفیات بھی بدل گئے۔ مادی جدلیات کا نظریہ غالب کے افکار میں نمایاں مقام حاصل کرنے لگا۔ شعوری طور پر دہلی کالج کے طلبہ نے (محمد حسین آزاد، نذیر احمد، ذکاء اللہ اور پیارے لعل آشوب وغیرہ) اسی نظریے کو قبول کیا جو سید احمد خاں کی نشاۃ الثانیہ کی تحریک میں تقویت کا سبب بنا اور یہی اواخر انیسویں صدی میں مسلم نشاۃ الثانیہ کا آغاز قرار پایا۔ ہیگل نے نے مادے پر شعور کو غالب سمجھا تھا لیکن اس کے شاگرد مارکس نے شعور پر مادے کو غالب بتایا چنانچہ تاریخی حالات کی تبدیلیوں سے مارکس کے مادی جدلیات کے نظریے کو تقویت ملی۔

اس تحریک نے بعض دوسری تحریکوں اور بعض اداروں کی تشکیل کی جن سے صرف نظر ممکن نہیں، چنانچہ معاشرتی اقدار، تصورات، عمرانی نظریات تہذیبی تصورات سب بدلنے

لگے۔ اجتماعی مزاج اور مذاق بدلنے لگے گویا ادب اور ثقافت کے ارض و سما بدل گئے اگر ان تغیرات کو نظر انداز کر کے کچھ افراد بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے رہیں تو وقت اُن سے کترا کر گزر جاتا ہے اور وہ وقت کے دھارے سے کٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ غالبؔ سے لے کر اقبالؔ تک کے دور میں جو تغیرات رونما ہوئے دونوں بزرگوں کے فن میں نمایاں ہیں اور دونوں کے شخصی مرثیوں میں جذب ہو چکے ہیں محض اسالیب کی حد تک نہیں بلکہ متخیلہ کی اساس میں بھی تفکر و تعقل کے حوالے سے مادی جدلیاتی تغیرات نے بعض منہاج کو یا تو یکسر بدل کر رکھ دیا اور یا ان میں جزوی ترمیم و تنسیخ کر دی۔

غالبؔ کا کائنات کے بارے میں اگر یہ خیال ہے کہ ؎

ہیں زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

تو اقبالؔ کا یہ تصور اپنی جگہ ایک نیا نظریہ اسی نظریئے سے اخذ کرتا ہے :

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

گویا کائنات کی ہر تخریب ایک نئی تعمیر کی طرف انتہائی بلیغ اشارہ ہے جسے خلیفۃ الارض تکمیل کو پہنچائے گا، چنانچہ ہر دور اور ہر زمانے میں " روحِ عصر" کی شناخت کرنا اور طین (TAINE) کے نظریۂ نسل، وقت اور زمانے کو سمجھ کر ادب اور شاعری کا موضوع بنانا اُس عبقری شاعری کا فرض ہے جو زندہ لفظ تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلامی مابعد الطبعیات اور مادی جدلیات کے مابین بُعدِ مشرقین موجود ہے۔ دونوں متضاد نظریے ہیں لیکن کائنات کے ارتقاء میں زمان و مکان کا مادی تصور ایک ایسا پیمانہ ہے جسے آج کا مادی ذہن بخوبی اور بآسانی قبول کرتا ہے۔ جس کا تعلق ہمارے کرۂ ارض سے وابستہ ہے۔

مابعد الطبعیات کے زمان و مکان کا مادّی تصور عنقا ہے۔ خود علامہ اقبال نے مادّی جدلیات کے تصوّر کو عقل اور عقلی فلسفے کے تابع رکھا ہے اور مابعد الطبعیاتی قوت کو عشق قرار دیا ہے:

"پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو" عقل"
"عشق" ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں "عشق"
"عقل" ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عقل جملہ حواسِ خمسہ سے عبارت ہے جس کے لیے جسم ضروری ہے۔ جسم کے لیے ماحولِ ارض و سما ناگزیر ہے گویا مادی وجود جدلیاتی اعمال وظائف کے تابع ہے عشق اس سے ماورا ہوا ہے۔

عشق میں سرشاری اور وجدان کی روشنی ہے جو اپنی سمت کا خود تعین کرتی ہے۔ غالب نے کمالِ آدمیت کے لیے عقل کو رہبر مانا ہے " طب و نجوم و منطق و ہیئت و فلسفہ پڑھ جو آدمی بنا چاہیے " اور دین کے لیے نقط " خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام یہی ہے مذہب حق والسلام الاکرام" اس طرح غالب اور اقبال دونوں نے انسان اور کائنات کے باب میں روشن خیالی کی تفسیر پیش کر کے حقِ شاعری بھی ادا کیا اور حقِ انسانیت بھی اسی روشن خیالی کو مختلف عنوانات میں تقسیم کر کے ہر بڑا شاعر اپنا فرض ہر زمانے میں ادا کرتا رہا اور اس وراثت کو آگے بڑھاتا رہا۔

شخصی مرثی لکھنے والے شعراء بھی اپنے دل و دماغ کو تاریخی معاشرتی، عمرانی نفسیاتی اور تہذیبی عوامل اور محرکات سے الگ تھلگ نہیں رکھ سکتے کہ ہر شخصیت خود بھی اپنے ماحول سے چسپاں ہوتی ہے اور تخلیق کار خود بھی اسی ماحول کا حصہ ہوتا ہے۔ ژونگ کے آرکیٹائپل نظریے کو سامنے رکھیے تو تخلیق کار کی سائیکی کی تہیں اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہیں اور کچھ

ایسے محرکات بھی سامنے آتے رہیں جو عام حالت میں ہر شخص کو نہیں سوجھ سکتے۔ چنانچہ جب آلِ رضا اور جوشؔ نے اپنے زمانے کی روشن خیالی کو ملحوظ رکھ کر جدید مرثیے کہے تو قدیم روش کے شعرا بدک گئے اور انھوں نے جدید مرثیے کو مرثیہ ہی تسلیم نہیں کیا لیکن روشن خیال اور جدید علوم سے بہرہ ور شعرا، اور سامعین ناظرین اور قارئین نے بھی جدید مرثیے کی جدید فکر کا خیر مقدم کیا۔ پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے آلِ رضا کے جدید مرثیے اور جوشؔ کے مرثیوں کا خیر مقدم کیا۔ احتشام حسین کے ہمنوا ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے جو آج لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

لیکن فی الحال اس پیچیدہ بحث کو چھوڑ کر صرف اس قدر عرض کرنا مقصود ہے کہ شخصی مرثیے کی شخصیت شاعر کو کسی نہ کسی زاویے سے اہم نظر آنا چاہیے، وہ ذی علم، ذی وقار، ذی شعور بھی ہو سکتی ہے۔ حسن و جمال کا بہترین مرقع بھی ہو سکتی ہے وہ دولت، عزت، شہرت یا اقتدار کے حوالے سے بھی اہم اور ممتاز ہو سکتی ہے۔ سیرت اور کردار میں بے مثل ہو سکتی ہے غرض کہ اس کی ظاہری یا باطنی کشش اور اس کے خفی یا جلی اوصاف شاعر کو متاثر کر سکتے ہیں اور وہ ان پر قلم اٹھا سکتا ہے۔ یہ بھی ظاہری اور بدیہی امر ہے کہ اس شخصیت کا دنیا میں باقی نہ رہنا ہی شخصی مرثیے کا محرک ہوگا اور اسی مقام پر رثائی کیفیت پیدا ہوگی ورنہ نہ تو مرثیہ بن سکے گا اور نہ شاعر میں تحریک پیدا ہو سکے گی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی زندہ شخصیت کا قصیدہ تو لکھا جا سکتا ہے مرثیہ نہیں، گویا مرنے کے بعد ہی قدرِ نعمت بعدِ زوال کا احساس اُسے مرثیہ لکھنے پر آمادہ کرتا ہے اور قاری یا سامع پہلے سے شاعر کے جذبات میں ہمدردی کے ساتھ شریک ہو سکتا ہے۔

جن چند شخصی مراثی کا ذکر مقصود ہے ان کے مرثیہ نگار جدید مرثیہ نگار ہیں۔ جدید اور قدیم مرثیے کے فرق کی طویل بحث کو اٹھانا مقصود نہیں لیکن شخصی مرثیے اور جدید شخصی مرثیے کی قدر کو واضح کرنے کے لیے اس قدر اشارہ کرنا کافی ہے بلکہ ضروری ہے کہ چونکہ آلِ رضا اور جوشؔ

کو جدید مرثیے کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا جدید مرثیے کے معرض وجود میں آنے کے بعض محرکات اور پس منظر کو مختصراً بیان کر دیا جائے۔

کہتے ہیں کہ آلِ رضا نے جب اپنا پہلا جدید مرثیہ لکھنو کی ایک علمی ادبی اور تہذیبی مجلس میں پڑھا تو روشن خیال جدت پسند اور نئے ادبی تقاضوں اور رجحانات کے حامل مغربی اقدارِ ادب سے واقف ترقی پسند نوجوان بہت خوش ہوئے اور ادب برائے زندگی پر یقین رکھنے والوں کے حوصلے بلند ہوئے لیکن قدیم اور قدامت پسند قدیم روایت اور قدیم روائتوں سے چمٹے ہوئے لوگ منغض ہوئے حتیٰ کہ میر انیس کے خالوادے کے باقیات الصالحات میں اُس وقت قدیم لکھنوی موجود تھے اور اس مجلس میں شریک تھے جب اُن سے کسی نے رجوع کیا اور مذکورہ مرثیے پر تبصرے[۱] کے لیے کہا تو بولے کہ کیا اچھی واسوخت پڑھی ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جدید مرثیے نے جدید نظم کی جن خوبیوں اور معاشرتی تبدیلیوں کو جس قدر خوبی اور خوبصورتی سے جذب کیا تھا وہ حالی اور اقبال کے نظریات کے مطابق تھیں اور ادب کو سماجی تغیرات کا آئینہ دار ظاہر کرتی تھیں جبکہ دوسرا فریق ان تبدیلیوں سے بدکتا تھا اور روایات سے چمٹا ہوا تھا حالی اور اقبال تاریخی عمرانی اور معاشرتی تبدیلیوں کے زیرِاثر ادب کی صحت مند تخلیق کے قائل تھے اور ادب برائے ادب کے تصور اور نظریے کو مجہول برخود غلط از کار رفتہ اور فرسودہ سمجھتے تھے۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

---

[۱] جب راقم نے حضرت آلِ رضا مرحوم سے براہِ راست اس واقعے کی صحت یا تردید کے لیے رجوع کیا تو انھوں نے اس کی صحت سے انکار کیا تاہم اہلِ لکھنؤ مذکورہ روایت کو شد و مد سے نقل کرتے ہیں۔

لہٰذا جدید مرثیہ ترقی پسند رجحانات کا ترجمان بنا[1]، چنانچہ آج کے جن جدید مرثیہ نگاروں نے شخصی مرثیے کے ذیل میں مرثیے کہے ان میں سے چند مرثیہ نگاروں اور اُن کے فن کے بارے میں بطریق اختصار چند معروضات پیش کیے جاتے ہیں۔

یہ مرثیہ نگار ہیں حضرت شاہد نقوی، حضرت وحید الحسن ہاشمی اور حضرت اسیر فیض آبادی۔ ان کے مرثیوں کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

۱۔ علم کا سفر ــــــــ جناب شاہد نقوی درحال مولانا محمد مصطفیٰ جوہر مرحوم
۲۔ جوہرِ وراثت ــــــــ جناب وحید الحسن ہاشمی درحال مولانا محمد مصطفیٰ جوہر مرحوم
۳۔ زعیم ملت ــــــــ جناب وحید الحسن ہاشمی درحال آقائے ابوالقاسم خوئی مرحوم
۴۔ علم کی روشنی ــــــــ جناب اسیر فیض آبادی درحال مولانا محمد مصطفیٰ جوہر مرحوم

شاہد نقوی نے مابعد الطبیعاتی بلکہ اسلامی مابعد الطبیعیات کے حوالے سے احادیث کی بنیاد پر تصورِ علم پیش کیا ہے اور واضح طور پر یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ جملہ علوم کا منبع اور سرچشمہ حضور ختمی مرتبتؐ کی ذاتِ اقدس ہے اور اس کے بعد حضرت علیؑ علیہ السلام اس علم کے وارث ہیں (انا مدینۃ العلم و علیٌ بابھا) مورث اعلیٰ سے علم سفر کرتا ہوا ائمہ معصومین کو منتقل ہوتا رہا اور ائمہ اطہار کے بعد علم کے ورثاء، علماء، اور مجتہدین بنے، چنانچہ مولانا محمد مصطفیٰ جوہر اور ان کے فرزندِ ارجمند جناب طالب جوہری تک پہنچا۔

دنیا کے بڑے بڑے مفکرین کا خیال ہے کہ کسی کے شخصی یا کسی گروہ کے عقیدے اور نظریے سے بحث نہیں ہو سکتی کہ یہی جمہوری قدر ہے اور رواداری کا ماحصل ہے۔ جناب شاہد نقوی ہوں یا کوئی اور معتقد اور محترم شاعر ہو اس کے نظریات عقائد و مسلمات کو معرض بحث میں لائے بغیر اس

---

[1] مشہور مارکسی نقاد احتشام حسین مرحوم نے بھی اسی زمانے میں آلِ رضا کے مرثیے اور جوشؔ کی جدید انقلابی نظموں پر پُر مغز مقالے لکھے۔

کے فن پر بحث ممکن ہے چنانچہ مذکورہ مرثیے میں اگرچہ اسلوب بیان موثر ہے زبان و بیان کی خوبیاں بھی مسلم ہیں لیکن شخصی مرثیے میں مرکزی کردار کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کم ہے قاری اور سامع دونوں کو تشنگی کا احساس ہوتا ہے پھر یہ کہ علم کی اس قدر جاندار وسیع و عریض تمہید کے بعد اصل موضوع اور نفسِ مضمون پر بہرحال کچھ زیادہ توجہ کی ضرورت تھی۔ شاہد نقوی جیسے قادرالکلام جدید مرثیہ گو سے یہ توقع کی جارہی تھی کہ اس قدر اعلیٰ درجے کی تمہید کے بعد مرکزی کردار کے باب میں کچھ زیادہ کہا جائے گا جس سے شخصیت کے خدوخال بھی نمایاں ہوں گے اور اُن کے اوصافِ حمیدہ اور خصائل پسندیدہ جو علم کی ترویج و اشاعت کا موجب بنے، ظاہر ہوں گے۔ ۵۹ بندوں کے اس مرثیے میں مولانا جوہر مرحوم کے بارے میں کُل دس بند (۳۵ تا ۴۵) آئے ہیں۔ تاہم اس مختصر مرثیے میں بھی مولانا مرحوم کی شخصیت کا احاطہ (ایجاز و اختصار ہی کے ساتھ) ہو جاتا ہے، ملاحظہ ہو:

وہ چراغِ خانۂ ذہن و زباں علمِ کلام — جس سے محکم کر گئے نظمِ شریعت کو امام
کر دیا تیشے نے جسکے جہل کا قصہ تمام — دَورِ نَو میں فکرِ جوہر نے اسے بخشا دوام
اس سخی نے کتنے کم فہموں کا دامن بھر دیا
گنگ کو ناطق کیا، جاہل کو عالم کر دیا

تزکیہ، تفسیر، درس علم و حکمت، ذکرِ رب — منصبِ پیغمبری کے زاویے ہیں سب کے سب
تھی جو اس کو بھی تاسّیِ پیمبر کی طلب — اپنی حد میں اسکا بھی معمول تھے یہ روز و شب
دیکھ کر جوہر کی عظمت سوچتی تھی زندگی
امتی یہ ہے تو کیا ہوگی نبیؐ کی زندگی

مختصر سی اس کے علم و فضل کی ہے یہ مثال — آیۂ تطہیر کی تفسیر کی بائیس سال
اور ہوئی سرزد نہ بھولے سے بھی تکرارِ مقال — جو کہا اک بار پھر آجائے لب پہ کیا مجال
کتنی نسلوں کو سنایا "انما" کا تذکرہ
ہو گیا کتنا بسیط اہلِ کسا کا تذکرہ

اتقا معیار ہے انساں کی عظمت کے لئے
نیتوں کا حال مختص ہے فقط اللہ سے
متقی چہرے مگر رکھتے ہیں جلوے نور کے
دیکھنے والوں کے سر جھکتے ہیں ازخود بے کہے
میں نے دیکھا ہے میں کہدوں گا خدا کے سامنے
کتنے اونچے سر جھکے اس بے نوا کے سامنے

چاہتا اگر وہ تو دولت اس کی چوکھٹ چومتی
مالِ دنیا سے مگر کچھ اس کو رغبت ہی نہ تھی
جو کی روٹی کھانے والے کا تھا ذوقِ پیروی
اس کے فہم و فکر کا قبلہ تھا کردارِ علیؑ
بس کو اس کے زر و گوہر ترستے رہ گئے
عیش و عشرت کے حسیں منظر ترستے رہ گئے

اس کی چشمِ شوق میں قنبرؓ کے عرفاں کی جھلک
اس کے لہجے میں دلِ میثمؓ کے ایقاں کی جھلک
اس کے قول و فعل میں ایمانِ سلمانؓ کی جھلک
اس کے ایک اک لفظ میں تہذیبِ قرآں کی جھلک
فقر وہ جس سے عیاں ماضی کی عظمت ہوگئی
اس کو دیکھا، روئے بوذرؓ کی زیارت ہوگئی

ایک ایسا شاعرِ خوش گو کہ جس کا ہر کلام
فکر و اسلوب و بیاں کا معجزانہ انضمام
وہ غزل ہو یا قصیدہ، منقبت ہو یا سلام
اک خلش سی تہہ میں ہر مصرع کی مصروفِ خرام
فکر راہِ کربلا سے ہٹ کے چلتی ہی نہ تھی
ذہن سے یادِ شہیدِ غم نکلتی ہی نہ تھی

کم ہوا ہوگا کوئی شیدائی ایسا آل کا
ذکرِ اہلبیت تھا شام و سحر کا مشغلہ
نظم ہو یا نثر اسی رودادِ غم کا تذکرہ
کوئی موضوعِ سخن ہو آخری حد کربلا
اس کی ایک اک سانس گویا بے صدا فریاد تھی
دل سراپا کربلا تھا چشمِ نم سجاد تھی

چشمۂ فیض اس کے گھر سے مدتوں جاری رہا ایک دریا تھا جو کشتِ علم کو سینچا کیا
تھا مگر ڈر جس کا وہ لمحہ بھی آخر آگیا در پہ آکر دستکیں دینے لگا دستِ قضا
شمع دانش بزمِ کُن سے جانبِ داور گئی
بجھتے بجھتے بھی مگر اک شمع روشن کر گئی

ان بندوں کے بعد علّامہ طالب جوہری کے اوصاف بیان کر کے واقعہ کربلا سے ربط دے کر حسبِ روایت مرثیہ تمام ہو جاتا ہے۔
شخصی مرثیے کو جدید مرثیے سے جو خاص تعلق اور ربط ہے یہ بجائے خود ایک مستحسن روایت ہے کہ اُسے واقعہ کربلا سے اختصاص حاصل ہے اردو کے دوسرے شخصی مرثیوں میں یہ روایت موجود نہیں ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ دوسرے مرثیہ نگاروں کو واقعہ کربلا کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا، تھا، لیکن جدید شخصی مرثیہ موجود نہ تھا۔ یہ خاص جدید شخصی مرثیے کا فنی کمال ہے کہ اُس نے اس خونیں واقعے کو دنیا کے تمام المیوں پر فوقیت دی ہے کہ اس کے ہزار ہا اخلاقی پہلو موجود ہیں شخصی مرثیہ چونکہ شخصی سانحۂ ارتحال کا ذکر کرتا ہے لیکن بجائے خود اتنا بڑا سانحہ نہیں ہے کہ واقعہ کربلا سے بڑھ جائے لہٰذا تالیفِ قلوب کے لیے بھی اس کا ذکر ناگزیر بن جاتا ہے اور اخلاقی قدر کو اُجاگر کرنے کے لیے بھی کہ آمریت تمرد اور اللہ کے مقابل سرکشی کے ہاتھ پر بیعت کے بجائے شہادت کی موت قبول کر لی جائے۔ من حیث المجموع مرثیہ ہٰذا ان تمام مراحل سے خوب گزرا ہے اور جناب شاہد نقوی کے فنی کمالات اور شاعرانہ خوبیوں کا مرقع ہے۔

جوہرِ وراثت، جناب وحید الحسن ہاشمی کا معرکۃ آلارا شخصی مرثیہ ہے۔ جو مولانا مصطفیٰ جوہر کی شخصیت کے ہر پہلو کو اُجاگر کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ یہاں عمل خیر اور شر کا موازنہ کیا گیا ہے اور عمل کے ہر پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ازاں بعد مولانا مرحوم کی شخصیت کا احاطہ ہوا ہے اول الذکر

مرثیے کے مقابلے میں یہاں بھی اختصار موجود ہے یعنی کل ۱۶ بند کا مرثیہ ہے یعنی ایجاز میں جو تفصیل مضمر ہے وہی اس شخصی مرثیے کا کمال ہے۔ مذکورہ مرثیے میں تمہید اس قدر زوردار ہے کہ ابتدا ہی سے قاری اور سامع متوجہ ہو کر تمام و کمال مرثیے میں جذب ہو جاتا ہے۔

عمل حدیقۂ انسانیت کی خوشبو ہے　　عمل نجات کے پیکر کا زورِ بازو ہے
فضائے ذہن میں دشتِ طلب کا آہو ہے　　عمل نظر تو نہیں ہے نظر کا جادو ہے
دیارِ فکر میں حیران کُن تماشا ہے
عمل نہیں ہے تو انسان ایک لاشا ہے

عمل کی شرط ضروری ہے زندگی کے لئے　　یہ اک دلیل ہے عرفانِ آگہی کے لئے
قدم قدم پہ یہ حجت ہے آدمی کے لئے　　عمل امام ہے راہِ پیمبری کے لئے
خدا جو حشر میں فردِ حساب کھولے گا
بشر نہیں وہ بشر کے عمل کو تولے گا

عمل کی جلوہ گری نطق میں بیان میں ہے　　کبھی یہ تیر کبھی تیر کی کمان میں ہے
اگر ہو قید تو خلقِ خدا کی جان میں ہے　　اڑے تو خیرِ عمل کی طرح اذان میں ہے
مآلِ فکر میں یہ ہم مزاجِ قرآں ہے
بدن کی جان ہے نیتِ عمل رگِ جاں ہے

کہاں کہاں نہیں رنگِ عمل کی گل کاری　　محاذ کوئی بھی ہو اس کا فیض ہے جاری
کہیں نہ امن سے عاجز نہ جنگ سے عاری　　ازل سے تابہ ابد اس کی ہے عملداری
ملا کے خاک میں جب لوگ چھوڑ جاتے ہیں
لحد کی گود میں اعمال کام آتے ہیں

اس ذیل میں یہ بند بھی ملاحظہ ہو۔

عمل نظر کی ہے زینت عمل ہے قلب کا چین ہے اسکی جلوہ نمائی مصافِ بدر و حنین
اسی کی ضرب پہ قرباں عبادتِ ثقلین عمل کی آخری معراج کربلائے حسینؑ
یہیں حیات کو ماحول سازگار ملا
یہیں عمل کو مشیت کا اختیار ملا

خیر اور شر کے سلسلے میں شاعر نے موازنے کی جو راہ نکالی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو

جو بد نہاد ہے کرتا ہے وہ اصول سے جنگ وفا کے نخل سے نفرت حیا کے پھول سے جنگ
زنانِ مصر سے خوش عظمتِ بتولؑ سے جنگ نہ ہوں رسولؐ تو پھر نائبِ رسول سے جنگ
اسے خیبر نہیں قوت علیؑ کو مانتی ہے
اسی کی تیغ تو علمِ رجال جانتی ہے
طبیعتِ بشری کا مدار ہے خوں پر فسادِ خوں کا اثر مفسدانہ فکر و نظر
بریدہ نخل سے کیسی توقعاتِ ثمر حرام مغز کہاں لحمِ پاک کا ہمسر
وہ خوں بدن سے نکل کر جو رائیگاں ہو جائے
رگِ شہید سے ٹپکے تو جاوداں ہو جائے
اگر نہ خون میں ہوتا علوئے ایمانی تو چاک چاک تھی یوسفؑ کی پاک دامانی
تمام مکر سے پُر تھی ادائے شیطانی مگر بشر میں تھا زندہ شعورِ انسانی
جو افتخار بڑھا عصمتِ نبوت کا
وہ امتحان تھا یعقوبؑ کی وراثت کا

شاعر کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حسب و نسب کی طہارت سے ارفع و اعلیٰ عمل ظاہر ہوتا ہے۔

ملاحظہ ہو بند نمبر ۲۲ تا بند نمبر ۲۴

معاشرے کی اچھائی اور بُرائی اور اس کی افادیت کو بھی شاعر نے ملحوظ رکھا ہے۔

ملاحظہ ہو بند نمبر ۲۸ تا بند نمبر ۳۲

جوہرِ وراثت میں مولانا مصطفےٰ جوہر کی شخصیت ، ان کے حالات اُن کے علم و فن کی تحصیل اور اُن کے اعمال کا احاطہ نہایت خوبی اور خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔

ملاحظہ ہو بند نمبر ۳۹ تا بند نمبر ۵۲

یعنی ۶۱ بندوں میں سے چودہ بند شخصیت کا احاطہ کرتے ہیں لیکن شخصیت کا کوئی پہلو نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتا۔ جدید شخصی مرثیے کا یہی کمال ہے کہ ایجاز و اختصار کے باوجود کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے اور پوری شخصیت سامنے آجائے بالخصوص قارئین اور سامعین کا وہ طبقہ جو مذکورہ شخصیت سے واقف نہیں ہے کماحقہٗ واقف و آگاہ بھی ہوجائے اور شخصیت کے مخفی پہلو اس پر بخوبی واضح اور متجلّی ہوجائیں۔ وحید الحسن ہاشمی کے اسلوبِ بیان میں سادگی و پُرکاری ہے وہ غیر ضروری صنائع و بدائع سے عبارت کو بوجھل نہیں بناتے اور شخصی مرثیے کے مجوّزہ خاکے سے تجاوز نہیں کرتے تمہید سے لے کر خاتمے تک ایک ڈال تمام بند نفسِ مضمون اور نفسِ موضوع سے مربوط رہتے ہیں جدید مرثیے میں شخصی مرثیہ نگار لبسا اوقات اپنے ہنر کے اظہار کے لیے جو راستے نکالتے ہیں اُس میں ربط بار بار ٹوٹ جاتا ہے اور شخصیت کے خط و خال قائم نہیں ہوپاتے اور فن مجروح ہوتا ہے ہاشمی صاحب اوّل تا آخر اس وقیع نکتے کو ملحوظ رکھتے ہیں غالباً یہ ہنر انھیں آلِ رضا سے ودیعت ہوا ہے کہ جو بات تمہید کے طور پر بیان میں آتی تھی اُسے آخر تک نبھاتے تھے اور نفس موضوع سے فکری رشتہ باقی رکھتے تھے۔

ہاشمی صاحب کا دوسرا مرثیہ ہے زعیمِ ملتِ اسلامیہ (آقائے ابوالقاسم خوئی مرحوم اس میں کل ۴۸ بند ہیں اس میں شاعر نے یہ اہتمام کیا ہے کہ علم کی تمہید سے لے کر ابوالقاسم خوئی کے علم و فضل کا نہایت خوبی سے تذکرہ کیا ہے اور واقعۂ کربلا کے حوالے سے آقائے خوئی مرحوم

کی شہادت کا ربط قائم کیا ہے۔ اس مرثیے میں علم سے ربط کے لیے یہ چند بند علم کی تعریف میں ملاحظہ ہوں۔

حق بیں ہے حق نگار ہے حق آشنا ہے علم — جہلِ خرد مرض ہے تو اس کی دوا ہے علم
کونین میں وراثتِ کُلِ انبیا ہے علم — قرآں کے بعد قصۂ اہلِ کسا ہے علم
جو چاہتا ہے قلب کو علم آشنا کرے
پہلے وہ شخص اجرِ رسالت ادا کرے

انسانیت کے پیکرِ اصلی میں جاں ہے علم — دنیا تمام مثلِ دہن ہے زباں ہے علم
جاہل سمجھ رہا ہے کہولت نشاں ہے علم — صدیوں کا بوجھ سر پہ ہے لیکن جواں ہے علم
پروازِ علم دائرۂ دو جہاں میں ہے
اس کا اثر مکاں ہی نہیں لامکاں میں ہے

شامِ دیارِ جہل میں نورِ سحر ہے علم — اندھے معاشرے میں نبیؐ کی نظر ہے علم
جامد تعیناتِ جہاں میں سفر ہے علم — نامعتبر ہیں سارے ہنر معتبر ہے علم
تقدیرِ علم رازِ خدائے انام ہے
وحی الٰہ علم کی خوشبو کا نام ہے

باطل پرست دہر ہے حق کی طرف ہے علم — سارے فنون مثلِ گہر ہیں صدف ہے علم
نباضِ حال شارحِ عہدِ سلف ہے علم — ہم کیا ہیں خود نبیؐ نے کہا ہے نجف ہے علم
زیرِ قدم نہ تخت ہے سر پر نہ تاج ہے
بس اک صفت یہ ہے کہ سلونی مزاج ہے

عالم اسی لئے تو ہے دنیا میں سرفراز
اس کا دلِ گداز ہے انسانیت نواز
دنیا میں حُبِ آلِ نبیؐ پر ہے اسکو ناز
اس کے لغت میں پختگیِ فکر ہے نماز
عالم کو جب بھی روضۂ نبیؐ یاد آئے گا
ہو کر نجف سے ارضِ مدینہ میں جائیگا

عالم کے ہر عمل کی ہے زینت جمالِ علم
اس کی نظر کو کرتا ہے صیقل جلالِ علم
ہے اس کا اجتہاد مطیعِ کمالِ علم
عالم ہے مالدار بہ فیضانِ مالِ علم
قرآں اس کی فطرتِ احسن کیساتھ ہے
عالم کے سر پہ حضرتِ حجتؑ کا ہاتھ ہے

وحید الحسن ہاشمی شخصی مرثیے میں تاریخی کوائف اور سوانحی حالات کو نہ صرف یہ کہ نظرانداز نہیں کرتے بلکہ شخصیت کے خدوخال اجاگر کرنے میں ضروری سمجھتے ہیں۔ عمرانی معاشرتی اور تاریخی واقعات کو شخصیت کی نفسیاتی اور شخصی حیثیت کے اُجاگر کرنے میں لازمی سمجھتے ہیں۔

ملاحظہ ہو بند نمبر ۲۰ تا ۲۲

آقائے ابوالقاسم خوئی نے جن علماء اور مستند حوالوں سے علوم متداولہ حاصل کیے ان کا مفصل ذکر کرتے ہوئے شاعر نے ان کی گرفتاری اور شہادت کے واقعے کو رقم کیا لیکن حفظ مراتب کے لحاظ سے سید الشہداء کے اس شیدائی کی شہادت کو امام عالی مقام کا ایک فدائی اور جاں نثار جس انداز سے ظاہر کیا ہے وہ بجائے خود ایک وقیع سانحہ ٹھہرتا ہے۔

ملاحظہ ہو بند نمبر ۴۲ تا ۵۰

ازاں بعد واقعہ کربلا سے ربط دے کر مرثیہ تمام ہوتا ہے۔

وحید الحسن ہاشمی کے مذکورہ بالا دونوں مرثیوں میں فنی لوازمات کے ساتھ ساتھ

شخصیتوں کو حفظِ مراتب کے لحاظ سے جو مقام دیا گیا ہے اس نے جدید مرثیے میں شخصی مرثیے کی حیثیت اور افادیت کو اُجاگر کیا ہے۔ لگے ہاتھوں اسیرؔ فیض آبادی کے مرثیے پر نظر ڈالتے ہوئے چند معروضات ملاحظہ فرمالیجئے تو بطور تتمہ اس گفتگو کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا کر ختم کیا جائے۔ اس مرثیے کا عنوان ہے علم کی روشنی اس کے اکہتر۷۱ بند ہیں۔ یہ بھی مولانا محمد مصطفےٰ جوہرؔ کا شخصی مرثیہ ہے۔ مذکورہ مرثیے کی تمہید طویل ہے اور مولانا جوہرؔ مرحوم کا ذکر نسبتاً کم ہے۔ حضرت اسیرؔ کی خوش عقیدگی اور صنفِ مرثیہ سے مخلصانہ لگاؤ میں کلام نہیں لیکن ابھی جن مرثیہ نگاروں کا اوپر ذکر ہوا ہے ان کے مقابلے میں مشقِ سخن کے لیے گنجائش موجود ہے۔ زبان و بیان پر قدرت ہے اسلوب کا بھی ایک منفرد انداز ہے لیکن قدیم اور جدید مرثیہ نگاروں نے ہر موضوع اور ہر منہاج کے مسدسوں کا جس عرق ریزی اور مشقت سے مطالعہ کرکر کے اپنے لیے راستہ بنایا ہے۔ اُن پر اسیرؔ صاحب کو بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آل رضا، جوشؔ اور نسیمؔ امروہوی وغیرہ کا شمار تو خیر اساتذہ میں ہوتا ہے، نسیمؔ امروہوی اور اسیرؔ صاحب کے کلام کا ان سے موازنہ تو سوئے ادب ہے لیکن چند مثالیں اس بنا پر پیش کرنے میں مضائقہ بھی نہیں کہ اساتذہ کے کلام کے نمونوں کو ملحوظ رکھ کر اگر اپنے اسلوبِ بیان کے لیے کوئی راہ نکالی جائے اور جو جو مشکلات درپیش ہیں ان کے حل کے لیے مسلّم الثبوت اساتذہ سے رجوع کرلیا جائے تو غالباً یہ ایک نیک فال ہے۔ مثلاً اسیرؔ فیض آبادی نے مرثیہ ہذا میں جو مطلع ارشاد فرمایا ہے وہ نہایت خوب ہے

آئینۂ علوم کے جوہر نظر میں ہیں — تہذیبِ آگہی کے سمندر نظر میں ہیں
دریائے معرفت کے شناور نظر میں ہیں — روشن ستونِ دینِ پیمبر نظر میں ہیں
ان سے جو کسبِ نور کرے کامیاب ہے
ذرہ نہیں وہ علم کا اک آفتاب ہے

اسی کے ساتھ ساتھ ذرا نسیم امروہوی کے مرثیۂ جوشؔ کا مطلع ملاحظہ ہو۔

اے قلزمِ حیات ترا جوشؔ کیا ہوا | ہو جس کی بت شکن تھی وہ مدہوش کیا ہوا
آہٹ سے جو وقت کی وہ گوش کیا ہوا | کیوں منبرِ سخن ہے سیہ پوش کیا ہوا

پھوٹے نصیب جوشؔ کا منکا جو ڈھل گیا
شعر و سخن کا آج جنازہ نکل گیا

دونوں کا ایک ذرا موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ اساتذہ اس مقام سے کس خوبی اور خوبصورتی سے گزر جاتے ہیں اور دوسرے حضرات کو تمہید کے قائم کرنے میں مضمون کو آگے بڑھانے میں کون کون سی مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔ مانا کہ مرثیہ نگار اور مرثیے کی زیرِ گفتگو شخصیت دونوں وقیع ہیں اور ہر چند کہ اسیرؔ فیض آبادی کے مرثیے کی شخصیت وقیع ہے اور خود اسیرؔ فیض آبادی کا رتبہ نسیم امروہوی کے مساوی نہیں ہے لیکن اسی شخصیت (مولانا مصطفےٰ جوہر مرحوم) کے بارے میں جن دو شعراء نے (یعنی شاہد نقوی اور وحید الحسن ہاشمی) جو بیان کے راستے نکالے وہ بہرحال کم اہم نہیں ہیں۔ بہرحال فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست کے بموجب عقیدت اور ارادت کے اظہار کے لیے ہر پیرایۂ بیان خوب ہوتا ہے اور خوب سے خوب تر کی راہ ہموار ہوتی رہتی ہے یقین ہے کہ حضرت اسیرؔ جس راہ پر چل رہے ہیں۔ انشاء اللہ جلد یا بدیر اپنا مقام بنا لیں گے جو چیز اُن کے فن میں نمایاں ہے وہ ہے دورِ حاضر کے معاشرتی، تاریخی، عمرانی اور سیاسی حالات کا معاشی اور صنعتی تناظر میں معروضی تجزیہ۔ اسیرؔ کا سیاسی شعور ان کے مبلغ علم کے لحاظ سے پختہ اور بالغ نظری کے لحاظ سے اہم ہے۔ علم کی روشنی کے بارے میں ان کے نظریات محض مابعد الطبیعاتی نہیں مادی جدلیاتی بھی ہیں اور وہ "روحِ عصر" یعنی HISTOROCITY کے محرکات اور عوامل کو بخوبی سمجھنے بُوجھنے اور برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔

۔ ماہنامہ جوہر نمبر ۱۹۶۵

یہ شعور یہ آگہی جوان بندوں میں حضرت اسیر نے فراہم کی ہے اور جس تمہید کے لیے یہ زمین ہموار کی ہے وہ ہمارے دور کی سچی مرقع کشی ہے اور اس تمام صورتِ حال پر بطور مبصر حضرت اسیر کا بے لاگ تبصرہ ہے اور سچ پوچھیے تو ان کے زیرِ نظر مرثیے کا یہ مقام انھیں آئندہ آنے والے جدید مرثیہ نگاروں کی صف اولیں میں جگہ دینے کا ضامن ہے۔

حضرت اسیر نے اسی مرثیے میں جبر، تعدی، تمرد و سرکشی، بغاوت اور آمریت کے خلاف جو نظریات پیش کیے ہیں اور جس انقلاب کی نوید سنائی ہے وہ حریتِ فکر کا حسینی انقلاب ہے اس انقلاب کی روایت کو اسیر فیض آبادی کے مطابق نائبین امام نے آگے بڑھایا، مولانا مصطفیٰ جوہر بھی ان منفرد نائبین میں شامل ہیں

اس انقلابِ نو کی جہاں تک دھمک گئی دیوارِ کفر و بغض و دغا ئی درک گئی
باطل کی سانس اسکے گلے میں اٹک گئی جیسے زمین پاؤں تلے سے سرک گئی
سچائیوں کی فتح کا انداز دیکھیے
اک نائبِ امام کا اعجاز دیکھیے

ہر خطۂ جہاں میں ہوئے نائبِ امام تبلیغ و حفظِ دینِ پیمبر تھا جن کا کام
روشن ہے جن کے علم و تدبر کا احتشام ان نائبوں میں مصطفےٰ جوہر کا بھی ہے نام
دل میں کھلا ہوا جو مودت کا پھول ہے
یہ مرتبہ یہ اوج عطائے بتولؑ ہے

تقویٰ بدوش ان کی سحر بھی تھی شام بھی پیتے تھے ہر نفس یہ تولا کا جام بھی
یہ عاشقِ نبیؐ تھے فدائے امام بھی حاصل تھا علمِ دین بھی علمِ کلام بھی
ہم فکر و ہم مزاجِ ابوذرؓ کہیں انھیں
مردِ فقیہ و بندۂ حیدرؑ کہیں انھیں

کردار اک کتاب کی صورت کھلا ہوا لہجہ میں علم و حلم و تدبر بسا ہوا
سجدے کا داغ لوحِ جبیں پر سجا ہوا سانسوں کی موج موج میں تقویٰ رچا ہوا
جو فیضیاب ان سے ہوا سرفراز ہے
وہ شخصیت کہ جس پہ شرافت کو ناز ہے

ہو دوستوں کی بزم تو ہر شخص کے حبیب دنیا کی لذتوں سے الگ دین کے قریب
کم لوگ ہیں کہ جنکو یہ سب وصف ہیں نصیب عالم خطیب اہلِ نظر شاعر و ادیب
رنگِ سخن طہارت و عصمت لئے ہوئے
شعر و ادب گلاب کی نکہت لئے ہوئے
شاعر تھے آپ بیٹا بھی شعر و ادب کی جاں دونوں کے ذوقِ فکر میں کچھ فرق ہے کہاں
گر آپ علم و فقہ کے کہلائے آسماں یہ بھی فقیہ و عالمِ دوراں ہیں بے گماں
سب وصف جمع ہیں ابوطالب میں آپکے
"بیٹا وہی قدم بہ قدم ہو جو باپ کے" میر انیسؔ
حاضر ہوا جو کوئی مصائب میں مبتلا قرآں سے دعاؤں کا نسخہ بتا دیا
دامن اگر بڑھا کسی غربت نصیب کا دستِ عطا سے حسبِ ضرورت عطا ہوا
شکوہ کسی کو لب پہ نہ لانے دیا کبھی
سائل کو نامراد نہ جانے دیا کبھی
منبر سے علمِ دین کے گوہر لٹائے ہیں ذہنوں میں معرفت کے ستارے سجائے ہیں
بھٹکے ہوؤں کو جادۂ ایماں پہ لائے ہیں جوہر نے وہ خطابت کے جوہر دکھائے ہیں
جب فرض کر چکے وہ ادا تھک کے سو گئے
ذہنوں میں کربلا کے اجالے سمو گئے

اس کے بعد واقعہ کربلا سے ربط دے کر مرثیے کو تمام کیا ہے۔
من حیث المجموع چاروں مرثیوں نے جدید شخصی مرثیے کی روایت کو آگے بڑھایا ہے اور شعری ادب کی اس صنف کو معتبر بنانے کے لیے جس کد و کاوش سے کام کیا اور مرثیہ نگاروں نے جس خلوص اور صداقت سے اس میں اضافے کیے ان کی ایک الگ تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل

۶۱

علم کا سفر

کلیمِ آلِ عبا شاہد نقوی

زندگی کا نقطۂ اوّل نمودِ علم ہے
حرفِ کن لب پر مشیت کے درودِ علم ہے

۱

جب لبِ قدرت کی جنبش کُن کے پیکر میں ڈھلی
کنتُ کنزاً کی صدا مرضیِ داور میں ڈھلی
کائناتِ دہر ابھری، پیش منظر میں ڈھلی
زندگی کی مئے وجودیت کے ساغر میں ڈھلی
پرچمِ ہستی فضائے کُن پہ لہرانے لگا
کچھ نظر آتا نہ تھا، سب کچھ نظر آنے لگا

۲

جب نظر پڑتی ہے تصویرِ حیاتِ دہر پر
ڈھونڈتی ہے نقطۂ آغاز کو چشمِ بشر
ٹھوکریں کھاتے ہیں فہم و فکر تا حدِّ نظر
چادرِ شب اوڑھ لیتی ہے تعقل کی سحر
سوچتی ہے جستجو، تخلیقِ اوّل کون تھا
آج تو سب کچھ ہے بزمِ دہر میں کل کون تھا

(۳)

کون کر سکتا ہے اس رازِ نہفتہ کو عیاں
معتبر ہے صرف قولِ خالقِ کون و مکاں
وہ بھی جب مخلوقِ اول خود کرے اسکو بیاں
دوسرا کوئی کہے گا بھی، تو تا حدِ گماں
چشمِ انساں نارسا، فکرِ بشر معذور ہے
دُور کا پہلا سرا حدِ نظر سے دور ہے

(۴)

سوچئے، ہے کوئی بزمِ کُن میں جس نے برملا
اوّلِ مخلوق ہونے کا کیا ہو ادعا
کون ہے؛ کوئی نہیں صرف اک محمد مصطفیٰؐ
آج تک ناقابلِ تردید ہے جس کی صدا
سب سے پہلے اس کے کانوں نے سنی آوازِ کُن
ہے اسی کی ذاتِ اقدس نقطۂ آغازِ کُن

۵

گونجتی ہے آج بھی کونین میں اس کی صدا
سب سے پہلے حق نے میرے نور کو پیدا کیا
پھر اسی کا اور بھی اک قول دہرایا گیا
علم ہے مخلوقِ اول، بزمِ کُن کی ابتدا
فکر الجھتی ہے کہاں سے آگیا مذکورِ علم
خلقتِ اوّل ہے نورِ مصطفیٰؐ یا نورِ علم

۶

بے سبب حیران و سرگرداں ہیں افکار و عقول
معنویت میں ہیں یکساں دونوں اقوالِ رسول
ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں وہم و شک فضول
اک صفت اک ذات ہے اک اصل ہے اور اک اصول
ایک نورِ فہم ہے اک مرکزِ تفہیم ہے
نام ہے جس کا محمدؐ، علم کی تجسیم ہے

۷

یہ جیئے حل ہو گیا آغازِ کُن کا مسئلہ
ابتدائے عالمِ امکاں فقط اک نور تھا
فکر سے بالا، نظر کی دسترس سے ماورا
پیکرِ محسوس میں آ کر محمدؐ بن گیا
بے تکلف بزمِ کُن کی ابتدا کہیئے اسے
علم کہیئے یا محمدؐ مصطفیٰ کہیئے اسے

۸

ہو گیا ثابت کتابِ زیست کا عنوان علم
حدِ امکاں تک شعور و فہم کی میزان علم
"کنزِ مخفی" کا حصارِ دید میں اعلان علم
ذات کا عرفان علم، اللہ کی پہچان علم
زندگی کا نقطۂ اول نمودِ علم ہے
حرفِ کن لب پر مشیت کے درودِ علم ہے

(۹)

علم آیا، خانۂ ایجاد کا در وا ہوا
جلوہ جلوہ چہرۂ تکوین سے پردہ اٹھا
بزمِ ہستی میں ہوئے منظر بہ منظر رونما
روز و شب، شمس و قمر، ارض و سما، آب و ہوا
کرسی و لوح و قلم، جن و ملک پیدا ہوئے
بزمِ انجم بن کے اوراقِ فلک پیدا ہوئے

(۱۰)

اب اٹھی سوئے کمالِ فن مشیت کی نظر
اشرف المخلوق، انساں، شاہکارِ نقش گر
اک گندھی مٹی سے ابھرا پیکرِ آدم کا سر
صلب میں جس کے اترنا تھا وہ نورِ معتبر
حجلۂ کُن میں جو اب تک جلوۂ مستور تھا
تھا نظر کی حد میں اور پھر بھی نظر سے دور تھا

(۱۱)

اب فرازِ عرش پر گونجا یہ فرمانِ خدا
کر رہا ہوں آج قائم میں خلیفہ ارض کا
جب میں اسمیں روح پھونکوں سب کریں سجدہ ادا
رہ گئے حیراں ملک شرک اور بحکمِ کبریا
کون کہتا ہے سلامِ عجز پیکر کو نہ تھا
سجدۂ تعظیم گھر والے کو تھا گھر کو نہ تھا

(۱۲)

باعثِ تکریمِ آدم تھا وہ نورِ مصطفیٰؐ
صلبِ آدم میں جو قلبِ روح پر قائم ہوا
ہاں وہی نورِ محمدؐ، علمِ باری کی ضیا
کاشفِ کنزِ خفی، تکوینِ عالم کی بنا
بہرِ مسجودِ ملک، پہلی شہادت جس کی تھی
تھا جو نائب حق کا یہ ارضی خلافت جسکی تھی

(۱۳)

سوچیے جب ہو چکا تھا خلق نورِ مصطفےٰؐ

پا چکی تھی اپنی منزل "کنت کنزاً" کی صدا

پھر ضرورت کیا تھی؟ کیوں تکوین کا حلقہ بڑھا؟

کیوں ہوئے تخلیق خاک و آتش و آب و ہوا

کیوں زمیں پیدا ہوئی کیوں آسماں پیدا ہوئے

ان کا مقصد کیا تھا، کیوں کون و مکاں پیدا ہوئے

(۱۴)

اک حدیثِ معتبر میں ہے جواب اس امر کا

کھولتا ہے عقدۂ تکویں کو "لولاک لما"

غالباً اس مقصدِ خالق سے نورِ مصطفےٰؐ

باعثِ تکوینِ عالم، منبعِ ہستی بنا

تاکہ اس کے صدق سے تصدیق محکم ہو سکے

شاہدِ "کنزِ خفی" مشہودِ عالم ہو سکے

(۱۵)

آئے وہ اور اسکا وہ کردار ہو سب پر عیاں
جس کے ایک اک لفظ پر سجدہ کریں سچائیاں
اس کی وہ پہلی شہادت پیشِ خلاقِ جہاں
دیکھ کر اس کو لبِ کونین پر بھی ہو رواں
چیخ اٹھے دنیا کہ ذاتِ کبریا موجود ہے
ایسے سچے نے کہا بے شک خدا موجود ہے

(۱۶)

الغرض آگے بڑھی دنیا بڑھے فہم و شعور
منتقل ہوتا رہا اصلابِ طاہر میں وہ نور
ہوتے ہوتے صلبِ عبداللہ بنا جائے صدور
اور پھر سطحِ نظارہ پر ہوا اِس کا ظہور
وہ جو تھا تخلیقِ بزمِ کُن کا مقصد آگیا
پیکرِ محسوس میں نورِ محمدؐ آگیا

۱۷

اس نے کی آیاتِ باری کی تلاوت صبح و شام
جگمگایا تزکیہ کر کر کے کردارِ عوام
کر دیا اس نے مرتب علم و حکمت کا نظام
کنزِ مخفی کی شہادت کا ہوا یوں اہتمام
ذہنِ انسانی وجودِ رب کا قائل ہو گیا
مقصدِ تخلیقِ بزمِ دہر حاصل ہو گیا

۱۸

اب ضرورت تھی کہ انساں علم سے غافل نہ ہو
تیرگیِ جہل راہِ زیست میں حائل نہ ہو
ذہن آوارہ نہ ہو، سرگشتہ کوئی دل نہ ہو
وہ سفر کس کام کا جس کی کوئی منزل نہ ہو
ذہن و دل میں جذبۂ منزل رسی روشن رہے
جادۂ ہستی میں شمعِ آگہی روشن رہے

(۱۹)

اور یہ شمعِ آگہی، نورِ حبیبِ کبریا
تا ابد رہنا تھی قائم دہر میں اس کی ضیا
رہرووں کی آخری منزل وہ شہرِ علم تھا
جس کے جلوے سے ہوئی تھی اس سفر کی ابتدا
آ گیا آخر سرِ ساحل سفینہ علم کا
خود مدینے نے کہا میں ہوں مدینہ علم کا

(۲۰)

اب یہ ٹھہری شرطِ لازم ابنِ آدم کے لئے
احسنِ تقویم ہے معیارِ آدم پر جیئے
ضوفگن ہوں طاقِ دل میں فکر و دانش کے دیے
سروری چاہے تو جامِ علم و آگاہی پیئے
علم کی تنصیب سے پہلے کوئی سر خم نہ تھا
علم مسجودِ ملک تھا پیکرِ آدم نہ تھا

۲۱

خالقِ کُل پر بھی لازم تھا کہ ہر فردِ بشر
کر سکے طے تا بہ شہرِ علم بے زحمت سفر
علم باری کا مدینہ دُور سے آئے نظر
مرضیِ رب سے بنایا شہر نے خود اپنا گھر
جادۂ علم اب نظر افروز مثلِ مہر تھا
در تک آنا شرط تھا اگلے قدم پر شہر تھا

۲۲

لوگ در تک آئے در سے شہر میں داخل ہوئے
دامنِ افکار میں گُل ہائے دانش بھر لئے
فکر کے شیشے ضیائے علم سے لَو دے اٹھے
دل کی تہ سے آفتاب ابھرا دھندلکے چھٹ گئے
پا گرفتہ چھُٹ گئے زندانِ جہلِ علم سے
ہو گیا آباد شہرِ علم اہلِ علم سے

(۲۳)

پھر گئے لوگوں کے دن بگڑا مقدر بن گیا
آب قطروں کو ملی، ہر قطرہ گوہر بن گیا
خاک سے ذرّہ اٹھا، مہرِ منور بن گیا
کوئی میثمؓ، کوئی سلمانؓ، کوئی بوذرؓ بن گیا
پھر فرشتے ہو گئے حیران، سانسیں رک گئیں
دیکھ کر انساں کی رفعت پھر جبینیں جھک گئیں

(۲۴)

اس طرف بڑھتی جو دیکھی علمِ آدم کی ضیا
آ گئے لے لے کے خنجر ظلمتوں کے دیوتا
جہل نے بوجہل بن کر علم پر حملہ کیا
بندۂ لات و ہبل، اللہ سے ٹکرا گیا
زعمِ باطل کو مگر حق نے کچل کر رکھ دیا
چند کلیوں نے چٹانوں کو مسل کر رکھ دیا

(۲۵)

اب بساطِ دہر تھی اور سلسلہ پیکار کا
نور و ظلمت کا تصادم دیر تک جاری رہا
جہل نے سو بار شہرِ علم پر حملہ کیا
شہر تک لیکن نہ پہنچا، در بہت مضبوط تھا
جہل کا کوہِ گراں موجِ ہوا میں بہہ گیا
در سے ٹکرایا تو ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا

(۲۶)

ایک مدت تک یونہی پیکارِ خیر و شر رہی
اک مسلسل کرب میں گزری بشر کی زندگی
فطرتِ انساں کی بے مقصد تلوّن پروری
درمیانِ نور و ظلمت ٹھوکریں کھاتی پھری
بھیڑیئے انساں بنے خود آگہی کی دھوپ میں
دھوپ سرکی، آگئے پھر بھیڑیوں کے روپ میں

۲۷

پھر مشیت نے لیا انساں کا اور اک امتحاں
ہو گیا اب شہرِ حکمت چشمِ ظاہر سے نہاں
در مگر اب بھی تھا قائم چار جانب ضوفشاں
اوٹ میں اپنی چھپائے شہر کی تابانیاں
اب بھی آ جاتا تھا جو تک طلب کے جوش میں
وہ پہنچ جاتا تھا از خود شہر کی آغوش میں

۲۸

در رہا قائم اسے رہنا تھا تا روزِ شمار
ہاں مگر ہر دور میں بدلے گئے نقش و نگار
ایک در تھا جو ہوا بارہ رخوں سے آشکار
دیکھ لیتی تھی مگر باطن کو چشمِ اعتبار
اہلِ دانش جانتے تھے شہر کا در ایک ہے
آئینے بدلے ہیں آئینوں کا جوہر ایک ہے

۲۹

بارہویں منزل پہ جب پہنچا خرد کا قافلہ
امتحاں اک اور خالق نے لیا انسان کا
چشم ظاہر سے درِ حکمت بھی اوجھل کر دیا
شہر تو غائب ہی تھا اب در بھی غائب ہو گیا
شمعِ منزل بھی نظر کی حد سے اوجھل ہو گئی
پارہ پارہ تھی جو تاریکی مسلسل ہو گئی

۳۰

فکر کو دھندلا گئیں ماحول کی پرچھائیاں
لقمۂ ظلمت ہوا راہِ طلب کا ہر نشاں
جادۂ ایقاں پہ بکھریں وہم کی پگ ڈنڈیاں
تیرگی کا یہ تسلط تھا مشیت پر گراں
عدلِ خالق کا تقاضا تھا فضا روشن رہے
منزلِ ہستی کا سیدھا راستہ روشن رہے

(۳۱)

دستِ پُر نورِ مشیت نے سرِ راہِ طلب
جابجا قائم کئے مینارۂ علم و ادب
علم کی شمعیں جلائیں، کم ہوئی یلغارِ شب
تا بہ منزل زندگی کا راستہ روشن تھا اب

خود بخود کھلنے لگے جو راستوں میں بل پڑے
رہرووں نے شمع کی جانب نظر کی چل پڑے

(۳۲)

یہ چراغِ راہ، یہ منزل نما لمعاتِ نور
یہ فقیہ و مجتہد یہ شمع دارانِ شعور
روشنی دیتے رہے ہر دور میں نزدیک و دور
راہ دکھلاتے رہے صحرا میں مثلِ برقِ طور

اب سہارا علم کا تھا کم شعوری کا نہ تھا
دور تھی منزل مگر احساس دوری کا نہ تھا

(۳۳)

رہروں کو ہر قدم پر راہ بر ملتے رہے
فکر کو ہر دور میں اہلِ خبر ملتے رہے
شمع بر کف، مرجعِ اہلِ نظر ملتے رہے
نجمِ دانش زیست کے ہر موڑ پر ملتے رہے
آندھیوں میں بھی صداقت کا دیا روشن رہا
وقت بدلا، دور بدلے، راستہ روشن رہا

(۳۴)

وہ عرب ہو، مصر ہو، ترکی ہو یا لبنان ہو
سرزمینِ شام ہو یا خطۂ ایران ہو
یا عراق و لیبیا ہوں ارضِ ہندوستان ہو
ہر جگہ تھیں علم کی شمعیں جہاں انسان ہو
ارضِ پاکستان کو بھی ہر قدم رہبر ملے
دَورِ حاضر کو محمد مصطفٰے جوہر ملے

(۳۵)

وہ محمد مصطفےٰ جوہر، وہ شمعِ رہبری
وہ ستارا جس نے ظلمت پر بچھادی روشنی
وہ معلم جس کا ایک اک لفظ روحِ آگہی
وہ مفکر جس کا ایک اک سانس پوری زندگی
ہو کے جس سے مس اندھیرا روشنی لے کر اٹھا
جہل بھی آیا تو نورِ آگہی لے کر اٹھا

(۳۶)

جس نے ذروں کو ابھارا ماہ واختر کر دیا
آب دی قطروں کو ایسی رشکِ گوہر کر دیا
دن تو دن ہیں جس نے راتوں کو منور کر دیا
ایسا رہبر، گمرہوں کو جس نے رہبر کر دیا
اس نے سیکھا تھا سبق پہلی کتابِ علم سے
اس کا رشتہ تھا براہِ راست بابِ علم سے

(۳۷)

وہ چراغِ خانۂ ذہن و زبانِ علمِ کلام
جس سے محکم کر گئے نظمِ شریعت کو امام
کر دیا تیشے نے جس کے جہل کا قصہ تمام
دَورِ نو میں فکرِ جوہر نے اسے بخشا دوام
اس سخی نے کتنے کم فہموں کا دامن بھر دیا
گنگ کو ناطق کیا، جاہل کو عالم کر دیا

(۳۸)

تزکیہ، تفسیر، درسِ علم و حکمت، ذکرِ رب
منصبِ پیغمبری کے زاویے ہیں سب کے سب
تھی جو اس کو بھی تاسیِ پیمبرؐ کی طلب
اپنی حد میں اسکا بھی معمول تھے یہ روز و شب
دیکھ کر جوہر کی عظمت سوچتی تھی زندگی
امتی یہ ہے تو کیا ہوگی نبیؐ کی زندگی

۳۹

مختصر سی اس کے علم و فضل کی ہے یہ مثال
آیۂ تطہیر کی تفسیر کی بائیس سال
اور ہوئی سرزد نہ بھولے سے بھی تکرارِ مقال
جو کہا اک بار پھر آجائے لب پر کیا مجال
کتنی نسلوں کو سنایا "انما" کا تذکرہ
ہو گیا کتنا بسیط اہلِ کسا کا تذکرہ

۴۰

اِتقا معیار ہے انساں کی عظمت کے لئے
نیتوں کا حال مختص ہے فقط اللہ سے
متقی چہرے مگر رکھتے ہیں جلوے نور کے
دیکھنے والوں کے سر جھکتے ہیں از خود بے کہے
میں نے دیکھا ہے میں کہہ دوں گا خدا کے سامنے
کتنے اونچے سر جھکے اس بے نوا کے سامنے

(۴۱)

چاہتا گر وہ تو دولت اس کی چوکھٹ چومتی
مالِ دنیا سے مگر کچھ اس کو رغبت ہی نہ تھی
جو کی روٹی کھانے والے کا تھا ذوقِ پیروی
س کے فہم و فکر کا قبلہ تھا کردارِ علیؑ
لمس کو اس کے زر و گوہر ترستے رہ گئے
عیش و عشرت کے حسیں منظر ترستے رہ گئے

(۴۲)

اس کی چشمِ شوق میں قنبرؓ کے عرفاں کی جھلک
اس کے لہجے میں دلِ میثمؓ کے ایقاں کی جھلک
اس کے قول و فعل میں ایمانِ سلماںؓ کی جھلک
اس کے ایک اک لفظ میں تہذیبِ قرآں کی جھلک
فقر وہ جس سے عیاں ماضی کی عظمت ہو گئی
اس کو دیکھا، روئے بوذرؓ کی زیارت ہو گئی

۴۳

ایک ایسا شاعرِ خوش گو کہ جس کا ہر کلام
فکر و اسلوب و بیاں کا معجزانہ انضمام

وہ غزل ہو یا قصیدہ، منقبت ہو یا سلام
اک خلش سی تہہ میں ہر مصرع کی مصروفِ خرام

فکر راہِ کربلا سے ہٹ کے چلتی ہی نہ تھی
ذہن سے یادِ شہیدِ غم نکلتی ہی نہ تھی

۴۴

کم ہوا ہوگا کوئی شیدائی ایسا آل کا
ذکرِ اہلبیت تھا شام و سحر کا مشغلہ

نظم ہو یا نثر اسی رودادِ غم کا تذکرہ
کوئی موضوعِ سخن ہو آخری حد کربلا

اس کی ایک اک سانس گویا بصد فریاد تھی
دل سراپا کربلا تھا چشمِ نم سجاد تھی

(۴۵)

چشمۂ فیض اس کے گھر سے مدتوں جاری رہا
ایک دریا تھا جو کشتِ علم کو سینچا کیا
تھا مگر ڈر جس کا وہ لمحہ بھی آخر آ گیا
در پہ آکر دستکیں دینے لگا دستِ قضا
شمعِ دانش بزمِ کُن سے جانبِ داور گئی
بجھتے بجھتے بھی مگر اک شمع روشن کر گئی

(۴۶)

اب وہ شمعِ نو ہے اور اہلِ طلب کی رہبری
بزمِ کُن میں روحِ جوہر کار فرما ہے ابھی
ایسا بیٹا ہی سمجھ سکتا ہے عظمت باپ کی
قدرِ جوہر شاہ داند یا بداند جوہری
روحِ جوہر اب بقا کی باطنی منزل میں ہے
کربلا والوں کا طالب جوہری کے دل میں ہے

۴۷

جب جنازہ اس عظیم انسان کا گھر سے چلا
ساتھ تھے کتنے عقیدت مند، کتنے اقربا

ہر زباں پر تھا اٹھا دنیا سے اک رکنِ عزا
آج اس گھر سے چلی اک چلتی پھرتی کربلا

مجلسیں ہونگی، وہ کربِ روح کا عالم کہاں
مسکنِ سجاد تھا جس میں وہ چشمِ نم کہاں

۴۸

تھا عجب عالم، میں جب ہمراہ میت کے چلا
فکر الٹتی جاتی تھی اوراقِ عہدِ کربلا

ایک منظر پر مگر آکر تصور رک گیا
جم گیا نظروں میں نقشہ رخصتِ شبیر کا

یہ جنازہ سوئے مرقد کتنے کاندھوں پر گیا
وہ مسافر سوئے مقتل گھر سے خود چل کر گیا

(۴۹)

اللہ اللہ! رخصتِ شہ پر وہ محشر کا سماں
ہر طرف آہیں، کراہیں، زرد چہرے ہسکیاں
بی بیوں کا گریۂ بے اشک بچوں کی فغاں
خشک آنکھیں سب میں لیکن خونِ دل کی سیر خیاں
جا رہا تھا سوئے مقتل کارواں سالار بھی
گر رہی تھی قصرِ جاں کی آخری دیوار بھی

(۵۰)

وہ حرم میں رخصتِ آخر کو آنا شاہ کا
سب کی نظریں چہرۂ سرور پہ ہونٹوں پر دعا
چپکے چپکے شہ کا وہ فضہ سے کرتا مانگنا
جو اسی دن کے لئے سی کر گئی تھیں سیدہ
شہ کو فضہ نے دیا کرتا قیامت جاگ اٹھی
قلبِ زینبؑ میں بھی ماں کی اک وصیت جاگ اٹھی

۵۱

پاس آئی بڑھ کے چومی گردنِ شاہِ ہدیٰ
بازوئے زینبؑ پہ حضرت نے بھی اک بوسہ دیا
رو کے بولے لو بہن یہ مرحلہ بھی طے ہوا
وہ وصیت ماں کی تھی، یہ باپ کا فرمان تھا
اک یہ یادِ شام و کوفہ، اک یہ یادِ کربلا
کتنے رخ رکھتا ہے اے زینبؑ جہادِ کربلا

۵۲

کر رہے تھے جب بہم یہ گفتگو بھائی بہن
روحِ زہراؑ پاس تھی، لے آئی تھی دل کی لگن
سن کے باتیں اپنے بچوں کی لرزتا تھا بدن
تیغ ابھرتی تھی تصور میں کبھی طوق و رسن
ماں تھی آخر سوچیئے کیسی قیامت دل میں تھی
ہائے شہزادی مری کس کرب کی منزل میں تھی

۵۳

الغرض طے ہوگئی یہ منزلِ جاں سوز بھی
بسترِ بیمار کی جانب بڑھے سبطِ نبیؐ
غش میں تھے سجّاد، چونکے، شہ کی جب آہٹ سُنی
باپ کی صورت جو دیکھی غیر حالت ہوگئی
حال جب سجادؑ نے پوچھا تو شہ تھرا گئے
مختصر لفظوں میں ساری داستاں دہرا گئے

۵۴

کیا ہوئے وہ یاور و انصار؟ سب رخصت ہوئے
قاسم و عون و محمد ؟ وہ بھی جنت کو گئے
اور چچا عباسؑ؟ وہ دریا پہ جاکر سو رہے
اور مرا بھائی علی اکبرؑ؟ تو اب خاموش تھے
بس یہ کہہ پائے نظر میں روشنی باقی نہیں
میں ہوں یا تم، اور مردوں میں کوئی باقی نہیں

۵۵

پھر کیئے تفویض اسرارِ امامت شاہ نے
بسترِ بیمار سے اٹھے سوئے زینبؑ بڑھے
ہاتھ رکھ کر سر پہ بولے، لو بہن اب ہم چلے
شکرِ خالق، جتنے وعدے تھے وہ سب پورے ہوئے
ہم تو جاتے ہیں تمھیں اب قافلہ سالار ہو
اب یہاں سے کربلا کی تم امانت دار ہو

۵۶

کہہ کے یہ سوے درِ خیمہ بڑھے شاہِ زماں
یاں صفیں باندھے کھڑی تھیں دونوں جانب بی بیاں
سر جھکائے جب چلے سرور صفوں کے درمیاں
یوں لگا جیسے کھنچی جاتی ہو سب جسموں سے جاں
کانپ کر فضہ بڑھیں، خیمے کا پردہ اٹھ گیا
رونے والے رہ گئے، گھر سے جنازہ اٹھ گیا

۵۷

در پہ تھا رہوار جب نکلے شہِ عالی جناب
کون تھا جو تھامتا حضرت کے توسن کی رکاب
نہر کی جانب نظر کی شہ نے باچشم پُرآب
کھینچ لایا خیمے سے زینبؑ کو دل کا اضطراب
رو کے فرمایا کہ بھیا میں تمھارے پاس ہوں
میں بھی بیٹی ہوں علیؑ کی اب سے میں عباسؑ ہوں

۵۸

کہہ کے یہ آگے بڑھیں، تھامی رکابِ راہوار
دیکھ کر حسرت سے زینبؑ کو ہوئے حضرت سوار
خیمے میں زینبؑ گئیں، شبیرؑ سوئے کار زار
یاں گرا خیمے کا پردہ اُس طرف اٹھا غبار
روئے شہ روشن تھا وہ شوقِ شہادت دل میں تھا
جلوۂ ذبحِ عظیم اظہار کی منزل میں تھا

۵۹

منزلِ ذبحِ عظیم اب سوئے قربانی بڑھی
کٹ گیا سرور کا سر صحرا کی ویرانی بڑھی
اور آگے اک قدم تاریخِ ایمانی بڑھی
خود بخود پیشانیِ عابد کی تابانی بڑھی
منتقل ہو کر امامت جلوہ افگن ہو گئی
واں بجھی اک شمع یاں اک شمع روشن ہو گئی

۹۳

جوہر دانش

وحیدِ مودّت وحید الحسن ہاشمی

کہیں بناوٹی پھولوں پہ رنگ کھلتا ہے
وہی ہے اصل جو ورثے میں اس کو ملتا ہے

۱

عمل حدیقۂ انسانیت کی خوشبو ہے
عمل نجات کے پیکر کا زورِ بازو ہے
فضائے ذہن میں دشتِ طلب کا آہو ہے
عمل نظر تو نہیں ہے نظر کا جادو ہے
دیارِ فکر میں حیران کن تماشا ہے
عمل نہیں ہے تو انسان ایک لاشا ہے

۲

عمل کی شرط ضروری ہے زندگی کے لئے
یہ اک دلیل ہے عرفانِ آگہی کے لئے
قدم قدم پہ یہ حجّت ہے آدمی کے لئے
عمل امام ہے راہِ پیمبری کے لئے
خدا جو حشر میں فردِ حساب کھولے گا
بشر نہیں وہ بشر کے عمل کو تولے گا

(۳)

عمل کی جلوہ گری نطق میں بیان میں ہے
کبھی یہ تیر کبھی تیر کی کمان میں ہے
اگر ہو قید تو خلقِ خدا کی جان میں ہے
اڑے تو خیرِ عمل کی طرح اذان میں ہے
مآلِ فکر میں یہ ہم مزاجِ قرآں ہے
بدن کی جان ہے نیت عمل رگِ جاں ہے

(۴)

کہاں کہاں نہیں رنگِ عمل کی گل کاری
محاذ کوئی بھی ہو اس کا فیض ہے جاری
کہیں نہ امن سے عاجز نہ جنگ سے عاری
ازل سے تا بہ ابد اس کی ہے عملداری
ملا کے خاک میں جب لوگ چھوڑ جاتے ہیں
لحد کی گود میں اعمال کام آتے ہیں

۵

جہاں ہے حکم خدا کا اثر عمل بھی وہیں
جدھر اٹھائیں پیمبرؐ نظر عمل بھی وہیں
وہ شہرِ علم ہو یا اس کا در عمل بھی وہیں
وہ کوئی روئے کہ سوئے مگر عمل بھی وہیں

کسی سے دل میں نہ کڑھتا ہے اور نہ جلتا ہے
بس آدمی کے ارادے کے ساتھ چلتا ہے

۶

زمیں کے فرش پہ دیکھے جو کارِ انسانی
ہزار جاں سے فدا ہو فلک کی تابانی
بزور لے کے پہاڑوں کی کوکھ سے پانی
بشر نے کھیتوں کو دے دی عمل کی طغیانی

یہ تاشعورِ مکاں ہے کہ لامکاں تک ہے
نبیؐ بتائیں گے حدِ عمل کہاں تک ہے

(۷)

خدا کے حکمِ اطاعت میں ہے عمل شامل
ہر اتباع کی صورت میں ہے عمل شامل
نہ صرف شرحِ مودت میں ہے عمل شامل
ادائے اجرِ رسالت میں ہے عمل شامل
بشر کے جذبۂ نصرت کی داستاں ہے عمل
جہاں جہاں ہے نبوت وہاں وہاں ہے عمل

(۸)

عمل نظر کی ہے زینت عمل ہے قلب کا چین
ہے اس کی جلوہ نمائی مصافِ بدر و حنین
اسی کی ضرب پہ قرباں عبادتِ ثقلین
عمل کی آخری معراج کربلائے حسینؑ
یہیں حیات کو ماحول سازگار ملا
یہیں عمل کو مشیت کا اختیار ملا

۹

مگر ستم تو یہ ہے ظلم بھی ہے ایک عمل
اسی شجر میں تو لگتے ہیں جور و جبر کے پھل
اسی سے بنتے ہیں نمرودیت کے تاج محل
اسی کو کہتے ہیں فرعونیت کا دستِ اجل
عرب کے دشت میں یہ رہنِ تخت و تاج ہوا
پلک جھپکتے ہی سفیانیت مزاج ہوا

۱۰

اسی مزاج نے چاٹے ہیں کتنے زخمِ گلو
شکستہ ہو گیا اک پردہ دار کا پہلو
کفن کے نام پہ اوڑھا کسی نے اپنا لہو
گلاب ذبح ہوئے قتل ہو گئی خوشبو
جنہیں ہے اس میں تردد وہ لوگ غافل ہیں
یہ واقعات کتابِ عمل میں شامل ہیں

۱۱

تمام دہر ہے جب پنجۂ عمل میں اسیر
اور اس عمل کا ہر اک مرحلہ ہے عالمگیر
کہیں پہ بارشِ ایماں کہیں پہ ہے تکفیر
کہیں ہے نیتِ خالص کی پاؤں میں زنجیر
بشر کی فکر یہاں مبتلائے وحشت ہے
عمل ہے یا متشابہ خدا کی آیت ہے

۱۲

اگر عمل کی حقیقت سے باخبر ہو بشر
تضادِ فکر و عمل پھر کہیں نہ آئے نظر
عمل عرض ہے ارادہ عمل کا ہے جوہر
عمل کی ظاہری بنیاد ہے توارث پر
کہیں بناوٹی پھولوں پہ رنگ کھلتا ہے
وہی ہے اصل جو ورثے میں اس کو ملتا ہے

۱۳

ہے انتقالِ وراثت کا یہ اٹل قانون
جھلک دکھاتا ہے بچے میں والدین کا خون
مریضِ نسل میں ہوگا اسی مرض کا جنون
پدر کے کفر کا کیسے پسر نہ ہو مرہون

کرم نہ ہو تو کوئی کب بزرگ ہوتا ہے
جو گرگ زادہ ہے آخر وہ گرگ ہوتا ہے

۱۴

تمام شر ہے اگر نسل میں ہے کچھ خامی
ہو کوئی لاکھ معزز مگر ہے بدنامی
اب اس سے بڑھ کے نہیں کچھ ثبوتِ ناکامی
"بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی"

حرم کے بُت سببِ کارِ رہبری نہ بنے
خدا تو بن گئے پتھر سے آدمی نہ بنے

(۱۵)

قصور کچھ نہیں بچے میں اس کی فطرت کا
اثر تو آئے گا اجداد کی وراثت کا

اساسِ قلب پہ سایا ہی جب ہو ظلمت کا
کہاں سے آئے گا انساں میں نورِ غیرت کا

جو سانس لیتا ہے بے غیرتی کی پستی میں
عجب نہیں کہ پڑھا دے نماز مستی میں

(۱۶)

لہو میں جس کے ہو شامل مفادِ ذات کا رنگ
خود اس کو گھیرے میں رکھتی ہے اسکے دل کی اُمنگ

امیر بننے کی خواہش میں دو جہاں سے ہے جنگ
غرورِ جہل میں قرآں کو مارتا ہے خدنگ

ہے دل کا شوق کہ شاہِ حجاز ہو جائے
وضو ہو بعد میں پہلے نماز ہو جائے

۱۷

بداصل میں نہ ملے گی کہیں رگِ تکریم
شناخت اس کی دغا ہے خطاب اس کا لئیم
خدا کے حکم میں کرتا ہے رات دن ترمیم
اسی کو حق نے کہا سورۂ قلم میں زنیم
ثبوتِ فتنہ گری اس کی عام عادت ہے
خدا کے بعد گواہی کی کیا ضرورت ہے

۱۸

جو بدنہاد ہے کرتا ہے وہ اصول سے جنگ
وفا کے نخل سے نفرت جیالے پھول سے جنگ
زنانِ مصر سے خوش عظمتِ بتولؑ سے جنگ
نہ ہوں رسولؐ تو پھر نائبِ رسولؐ سے جنگ
اسے خبر نہیں قوت علیؑ کو مانتی ہے
اسی کی تیغ تو علمِ رجال جانتی ہے

۱۹

طبیعتِ بشری کا مدار ہے خوں پر
فسادِ خوں کا اثر مفسدانہ فکر و نظر
بریدہ نخل سے کیسی توقعاتِ ثمر
حرام مغز کہاں لحمِ پاک کا ہمسر
وہ خوں بدن سے نکل کر جو رائیگاں ہو جائے
رگِ شہید سے ٹپکے تو جاوداں ہو جائے

۲۰

اگر نہ خون میں ہوتا علوئے ایمانی
تو چاک چاک تھی یوسفؑ کی پاک دامانی
تمام مکر سے پُر تھی ادائے شیطانی
مگر بشر میں تھا زندہ شعورِ انسانی
جو افتخار بڑھا عصمتِ نبوت کا
وہ امتحان تھا یعقوبؑ کی وراثت کا

(۲۱)

یہ نسل دشمنوں کے خلاف آجکل مچی ہے جو دھوم
وہ چاہتے ہیں کہ یکساں ہوں ظالم و مظلوم
نہ کوئی فرق ہو مابینِ مجرم و معصوم
یہاں یہی ہے مساواتِ حشر نامعلوم

وہی نہ جائے گا جو ہے مقام جس کے لئے
تو پھر یہ دوزخ و جنت بنے ہیں کس کے لئے

(۲۲)

اگر لہو ہے مطہّر تو آدمی ہے جلیل
حسب نسب میں ہے اعلیٰ حسینؑ کی تمثیل
درود بھیجتے ہیں اس کے نام پر جبریلؑ
سلام کرتے ہیں اس کو جنابِ اسمٰعیلؑ

کچھ اتنا خیرِ عمل کے جلو میں رہتا ہے
گلا کٹے تو لہو لا الہٰ کہتا ہے

۲۳

اثر تو دیکھئے اصلاب کی طہارت کا
اجل کے سامنے قاتل کو دودھ کا تحفہ
جو دے رہا ہے اذیت اسی کے حق میں دعا
برہنہ پائی میں کانٹوں سے گفتگو کی ادا
جو پاک نفس ہیں وہ حق پہ صاد کرتے ہیں
پدر کی گود میں جا کر جہاد کرتے ہیں

۲۴

وہ پاک خوں کا اثر ہو کہ دودھ کی تاثیر
وفا پرست نہ ہوگا کبھی ریا کا اسیر
پہن کے پاؤں میں حکمِ امام کی زنجیر
کٹا کے ہاتھ وہ لکھتا ہے دین کی تقدیر
کوئی یہ خون فنا میں سمو نہیں سکتا
فرات کیا ہے سمندر بھی دھو نہیں سکتا

۲۵

جہاں میں جو بھی ہوئے صاحبانِ علم و عمل
حسب میں احسن و اعلیٰ نسب میں ہیں اکمل
کہیں بھی نسل میں ان کی نہ وسوسہ نہ خلل
جو گفتگو وہ مناسب جو فیصلہ وہ اٹل
ملی جو نعمتِ حق خاص زاویئے سے ملی
یقین خوں سے وجاہت معاشرے سے ملی

۲۶

معاشرہ بھی توارث کے ذیل میں ہے اہم
عمل کو کرتے ہیں راسخ روابطِ پیہم
کسی گروہ میں موجود اگر ہو پہلوئے ذم
وہ آگ کرتی ہے ہر فرد کی حیا کو بھسم
حیا نہیں تو ستانا برا نہیں لگتا
جگر کسی کا چبانا برا نہیں لگتا

(۲۷)

وہ کم نسب جسے مل جائے سلطنت کا نظام
وہ چاہتا ہے کرے قلبِ دوجہاں کو غلام
کبھی لٹاتا ہے دولت کبھی بڑھاتا ہے جام
زباں پہ دعوئ عصمت عمل تمام حرام
اماں طلب ہے خدا کی کتاب دکھلا کر
صنم پہ مرتا ہے اللہ کی قسم کھا کر

(۲۸)

برا معاشرہ توہینِ آدمیت ہے
یہ وہ عذاب ہے جس کا اثر ندامت ہے
بناؤ میں یہی ماحول اک ھدایت ہے
بگاڑ میں پسرِ نوحؑ اک علامت ہے
جو ذات حکمِ نبی سن کے آنہیں سکتی
اسے نبی کی قرابت بچا نہیں سکتی

۲۹

معاشرے ہی سے بنتا ہے آدمی کا مزاج
یہی سجاتا ہے انسانیت کے فرق پہ تاج
ہے بھائی بھائی کا قاتل اگر برا ہے سماج
معاشرے میں ہے یوسف کو بیچنے کا رواج
یہاں تو دیں کے سب آثار سوخت کر ڈالیں
خدا ملے تو اسے بھی فروخت کر ڈالیں

۳۰

مرے سماج کا انسان سر پھرا بھی ہے
یہ پُر فتن بھی پُر آشوب و پُر خطا بھی ہے
کشیدہ سر بھی ہے حرفوں کا یہ بنا بھی ہے
بتوں کو خلق بھی کرتا ہے پوجتا بھی ہے
قعود سے نہ غرض ہے نہ کچھ قیام سے ہے
سراپا کفر ہے بیعت طلب امام سے ہے

(۳۱)

مگر جو مرد ہیں اعلیٰ سماج رکھتے ہیں
شریف طبع لدُنیؐ مزاج رکھتے ہیں
نہ کچھ غرض نہ کوئی احتیاج رکھتے ہیں
سروں پہ سورۂ کوثر کا تاج رکھتے ہیں
یہ اپنے قول کی سچائیوں پہ مرتے ہیں
نڈر ہیں ایسے کہ بس اک خدا سے ڈرتے ہیں

(۳۲)

معاشرے سے ملا ان کو ذوقِ خودداری
عروجِ دست نے پائی ادائے بت شکنی
رگوں میں دوڑ رہا تھا جو خونِ مطلبی
لبوں کی بن گئی زینت دعائے نادِ علیؑ
یہی چراغ تو گھر میں نبیؐ کے جلتا ہے
سماج چادرِ تطہیر ہی میں پلتا ہے

۳۳

عجب ہے ہاشمی ماحول کی فسوں کاری
غلام جاہ و حشم ہیں کنیز سرداری
جہاں پہ ان کی وجاہت کا رعب ہے طاری
حلیف سارے ہیں نوری حریف ہیں ناری
یہیں ہے ثبت نشاں آخری نبوت کا
یہیں سے اٹھا ہے پہلا قدم امامت کا

۳۴

علوم کے یہ سمندر فیوض کے بادل
شجاعتوں کے درختوں پہ احتیاط کے پھل
اذان ان کا تکلّم نماز ان کا عمل
مجال کیا کہ ارادے میں ان کے آئے خلل
خجل ہو شمس وہ روشن ضمیر ہیں ان میں
امیر دیکھیں جنابِ امیرؑ ہیں ان میں

(۳۵)

یہ حکم دیں تو ستاروں کی چال تھم جائے
جہاں یہ چاہیں سمندر وہیں پہ جم جائے
بلا سے حق کی حمایت میں اپنا دم جائے
یہ فیصلہ ہے نہ اسلاف کا بھرم جائے
یہ ان کا عزم ہے گردن کٹے نظر نہ جھکے
کوئی سماج ہو عمرانیوں کا سر نہ جھکے

(۳۶)

سماج کو ابوطالب نے زندگی دی ہے
اندھیرے کے زمانے کو روشنی دی ہے
غمِ حیات کا منہ چوم کر خوشی دی ہے
خموشیٔ لبِ اسلام کو ہنسی دی ہے
معاشرے کے گڑھے زخمِ دل سے پاٹے ہیں
ہنسی خوشی سے غموں کے پہاڑ کاٹے ہیں

(۴۷)

انہی کے نقشِ قدم پر چلے وفا والے
بدن پہ سورۂ اخلاص کی قبا ڈالے
اگرچہ پاؤں میں پیہم پڑا کئے چھالے
مگر رکے نہ شجاعت کی گود کے پالے
عجیب رنگ یہ شامل ہوا فسانوں میں
معاشرے کو ملا چین قید خانوں میں

(۴۸)

وراثتِ بشری سہ رہی تھی ضربِ شدید
وفا کی نسل کو للکارتی تھی نسلِ یزید
وہ دستِ ظلم میں بابِ معاشرہ کی کلید
خدا کی آیتیں ہونے لگیں چھری سے شہید
ملول دین تھا ماحول میں اندھیرا تھا
وفا پرستوں کو عباسیوں نے گھیرا تھا

(۳۹)

وطن سے بے وطنی کی طرف چلے مظلوم
نہ منزلوں کا تعین نہ راستے معلوم
کوئی حبش کو گیا اور کوئی فارس و روم
زمینِ ہند پہ روشن ہوئے عرب کے نجوم
یہاں نہ کرب نہ دار و رسن کی بات ہوئی
بتوں کے دیس میں اک بت شکن کی بات ہوئی

(۴۰)

حدودِ سندھ میں پہنچی کلامِ حق کی صدا
جلا دکن میں چراغِ نظامِ آلِ عبا
حدیث و فقہ کا پنجاب کو ملا تحفہ
اُگا اودھ میں اصولِ کلام کا پودا
نفاذِ شرع کے نکلے ہر اک دیار میں پھول
بہار آئی اودھ میں کھلے بہار میں پھول

(۴۱)

بہار ادب کا مدینہ فضیلتوں کا نگر
بہار علم کا مسکن شعور و شعر کا گھر
بہار باغِ تکلّم کا اک شگفتہ شجر
دہن بہار تو آواز مصطفےٰ بجوہر

وجود ان کا یہ پہلو عجب دکھاتا ہے
جو مصطفےٰ ہے وہ مسلم کے گھر میں آتا ہے

(۴۲)

پدر سے علم ملا ماں سے استقامتِ فکر
رواں تھی خون میں اجداد کی اصالتِ فکر
دماغ میں جو فروزاں رہی دیانتِ فکر
پدر کے بعد پدر کی ملی وراثتِ فکر

سلف کی مِلک سے بیدارئ نظر لے لی
زمین و زر کے عوض چشمِ معتبر لے لی

(۴۳)

شرافتِ نسبی کا نمونۂ عملی
تمام عمر نظر میں حیا کی شمع جلی
رضائے حق میں کٹی زندگی بری کہ بھلی
جبیں پہ خاک ملی بھی تو کربلا کی ملی
نبیؐ کے فیض سے حاصل جو تھی ولائے حسینؑ
بسی تھی دل کے مدینے میں کربلائے حسینؑ

(۴۴)

اگرچہ مسندِ علم و عمل تھی آبائی
نمودِ فن پہ طبیعت کبھی نہ اترائی
ہر ایک دور میں سیرت یہی نظر آئی
دل و نگاہ حسینی ، مزاج مولائی
اگرچہ دل میں سدا ذوقِ اجتہاد رہا
مگر نجف کا سبق ساری عمر یاد رہا

(۴۵)

حصولِ علمِ جدیدہ کو جانتے تھے مباح
حیات بخشِ عمل تھا تقدسِ ارواح
جلائے رکھا نگاہوں میں دین کا مصباح
بہت پسند تھی کھجواؔ کی کاوشِ اصلاحؔ
چمن چھٹا تو کہاں حسنِ رنگ و بو پہنچا
گلِ بہار کھِلا کھل کے لکھنؤ پہنچا

(۴۶)

کلیمِ عصر جو پہنچا قریبِ باقرِ طور
یقیں کے ہوگیا ہمدوش اعتبارِ ظہورؔ
بفیضِ ہادیؔ دیں قلب ہوگیا پُر نور
رضاؔئے حق کی بدولت گماں ہوا کافور
گئے ملک سے ہر اک صاحبِ شعور کے پاس
نشانِ امر ملا ناظمِ امور کے پاس

(۴۷)

اصولِ فقہ پہ تھی دسترس کلام ازبر
اسیرِ ذوق تھی منطق، رجال پیشِ نظر
حدیث نوکِ زباں اعتقاد مستحضر
لٹاتے رہتے تھے اسباقِ فلسفہ کے گہر
زباں پہ مصطلحاتِ جہاں کی باتیں تھیں
خدا کے سجدوں میں دن تھے عزا میں راتیں تھیں

(۴۸)

غریبِ شہر نمائندۂ امارتِ دل
ثقافتِ ابدیت کا جوہرِ قابل
ضیائے جلوۂ مشہد سے حل ہوئی مشکل
نصیب دیکھئے مسکن ملا "رضا منزل"
بہار جس سے رخِ صبح و شام پر آئی
وہ روشنی ابوطالب کے نام پر آئی

۴۹

مگر خلافِ عزا ہند میں ہوئی سازش
عبادتوں پہ لگائی گئی نئی بندش
بڑھی جو دینِ مسلماں پہ کفر کی یورش
فراقِ باغ کی خود پھول کو ہوئی خواہش
سکونِ قلب کو ماحول تابناک ملا
دیارِ کفر جو چھوٹا دیارِ پاک ملا

۵۰

یہاں نظر تھی جو خیرِ امور کی جانب
سدا تحفظِ دیں کی طرف رہے راغب
ادائے اجرِ رسالت کو جان کر واجب
خوشی سے پال کے ملت کو دے دیا طالب
نہ اہلِ جاہ و حشم سے نہ اہلِ زر سے ملی
مدد سماج کو پھر مصطفےٰ کے گھر سے ملی

(۵۱)

ہر اک دیار میں چرچا ہے ان کی عظمت کا
کہیں پہ کشفِ نظر کا کہیں خطابت کا
ثبوتِ حق کا تفاسیر کا ہدایت کا
کہیں صراحتِ دیں میں قلم کی عصمت کا
نہ ہجوِ فن نہ خوشامد کسی سخنور کی
مگر جو بات لکھی ہے لکیر پتھر کی

(۵۲)

عجیب رخ تھا طبیعت غنی مگر بے چین
قدم زمیں پہ قدم پر سعادتِ کونین
دلِ غیور تو نگر مگر نہ زیب نہ زین
نشانِ سجدہ جبیں پر لبوں پہ ہائے حسینؑ
زمینِ خشک پہ آبِ خیال بہتا تھا
نظر نجف میں تھی دل کربلا میں رہتا تھا

۵۳

کچھ اس طرح غمِ شبیرؑ میں حیات کٹی
اذانِ صبح سنی دل میں چبھ گئی برچھی
کبھی جو گرم ہوا دشت کی طرف سے چلی
نظر میں پھر گئی سوکھی زبان اصغرؑ کی

نہ دل سے محو ہوئی وہ شبِ قیامِ نماز
جلی قناتوں پہ زینبؑ کا اہتمامِ نماز

۵۴

فضا ہے شامِ غریباں کا بار اٹھائے ہوئے
زمیں پہ بیبیاں بیٹھی ہیں سر جھکائے ہوئے
ردا نہیں ہے تو بالوں سے منہ چھپائے ہوئے
وفورِ شرم سے مقتل سے رخ پھرائے ہوئے

یتیم بچوں کے اب پاس کیوں نہیں آتے
مدد کا وقت ہے عباسؑ کیوں نہیں آتے

۵۵

یہ رات عالمِ احساس میں نرالی ہے
بساطِ درد پہ مائیں ہیں گود خالی ہے
جہاں نے رسمِ اذیت عجب نکالی ہے
دوا کے پاؤں میں زنجیرِ درد ڈالی ہے
کسی نے کب یہ ستم ہائے برملا دیکھے
غیور بھائی ہو بہنوں کو بے ردا دیکھے

۵۶

نماز فرض ہے وہ بھی ادا کرے زینبؑ
پڑا ہے غش میں بھتیجا دوا کرے زینبؑ
ستم اٹھائے کہ ردِّ بلا کرے زینبؑ
اکیلی جان ہے صحرا میں کیا کرے زینبؑ
نبیؐ کے گھر کی حفاظت کا انتظام کرے
خود اپنا کام بھی عباس کا بھی کام کرے

۵۷

ذرا کوئی علی اکبر کے کان میں کہہ دے
پھوپھی کی چھن گئی چادر کھڑی ہے سر ننگے
بہن کے لے گیا کوئی اتار کر بُندے
لگی وہ آگ کہ اصغر کے جل گئے کُرتے

لہو کے رشتے کا انجام دردناک ہوا
بہن نے بھیجا تھا جو خط وہ جل کے خاک ہوا

۵۸

اندھیری رات ہے پردیس ہے فضا مسموم
زمینِ گرم پہ بکھرے ہیں مصطفٰے کے نجوم
پکارتی ہے سکینہ ہو یا شہِ مظلوم
اٹھا کے گود میں کہتی ہیں پیار سے کلثوم

پدر کی راہ میں دنیا کے سو جھمیلے ہیں
گئے ہیں دشت میں اصغر وہاں اکیلے ہیں

۵۹

سنا جو نامِ برادر تو دل ہوا بے آس
کہا پھوپھی سے کہاں ہیں مرے چچا عباس
یہ کیسا پیار ہے کیسی ادا ہے کیا احساس
انھیں خبر نہیں مجھ کو ہے تین روز سے پیاس
لگا ہے زخم انھیں فکرِ اندمال نہیں
چچا کو اپنی بھتیجی کا کچھ خیال نہیں

۶۰

یہ کس گناہ کی پاداش میں اجڑ گیا گھر
یہ کس کے سوگ میں سب نے اتار دی چادر
مریض فرشِ زمیں پر ہے کیا ہوا بستر
یہ کون لے گیا گہوارۂ علی اصغر
پھوپھی بتائیں یہ وحشت نظر کو ڈستی ہے
یہاں سے کتنے قدم پر نجف کی بستی ہے

(۶۱)

وہاں سنا ہے کوئی ڈر نہیں پھوپھی اماں
وہاں کوئی بھی کھلے سر نہیں پھوپھی اماں
وجودِ قاتلِ اصغر نہیں پھوپھی اماں
وہاں پہ شمر کا خنجر نہیں پھوپھی اماں
مریضِ غم کو وہاں سختیاں نہیں دیتے
یتیم ہو تو اسے گھڑکیاں نہیں دیتے

(۶۲)

خدا کرے کہ پھوپھی میں وہاں پہنچ جاؤں
تمام واقعۂ جانگداز پہنچاؤں
نجف سے دادا کو انگلی پکڑ کے لے آؤں
انہی کے بچوں کی آہیں انہی کو سنواؤں
خبر جو آمدِ مشکل کشا کی پائیں گے
پھوپھی فرات سے عمّو ضرور آئیں گے



مرثیہ

آقائے خُوئی اعلی اللہ مقامہ

وحیدِ مودت وحید الحسن ہاشمی

قرآن اس کی فطرتِ احسن کے ساتھ ہے
عالم کے سر پہ حضرتِ حجت کا ہاتھ ہے

(۱)

انساں کائنات کے خالق کا نور ہے
یہ کبریائے کون و مکاں کا غرور ہے
ممکن کی حد پہ صاحبِ عقل و شعور ہے
کچھ واجب الوجود سے نسبت ضرور ہے
دیوار سے نہ پوچھئے معمار کون ہے
فن خود بتائے گا مرا فنکار کون ہے

(۲)

انساں انیسِ بزم سخندانِ معرفت
انساں دبیرِ دفترِ ایمانِ معرفت
انساں رئیسِ شوکتِ ایوانِ معرفت
انساں عروجِ مدحتِ سلطانِ معرفت
جو یائے علم، علم کی پہچان بن گیا
اتنا ہوا بلند کہ سلمانؓ بن گیا

(۳)

انساں ثبوتِ ہستیٔ خلاقِ دوجہاں
انساں دلیلِ عظمتِ مسجودِ ہر زماں
حق نے اسے بنایا حقیقت کا ترجماں
صدقِ زباں سے بن گیا اللہ کی زباں

دستِ عطائے حق کا ہوا خواہ ہو گیا
ہاتھوں سے بت گرائے یداللہ ہو گیا

(۴)

حق نے اسے وجود کا وجدان دے دیا
احسن بنا کے حسن کا ارمان دے دیا
تھوڑا سا اپنے غیب کا ایقان دے دیا
قرآں کے ساتھ آل کا عرفان دے دیا

بتلا دیا تدبرِ قرآں ثواب ہے
پوشیدہ ایک نقطۂ با میں کتاب ہے

(۵)

انسان کے طفیل یہ چرخِ بریں بنا
خلقت یہ تھی حسیں تو زمانہ حسیں بنا
جلوہ بعید منظرِ جلوہ قریں بنا
عالِم جو تھا معلّمِ روح الامیں بنا
پیدا ہوا ہے منزلِ برکات کے لئے
اس کا دہن خدا نے چُنا بات کے لئے

(٦)

انسان بوستانِ وفا کا گلاب ہے
ذروں کے درمیاں ہے مگر آفتاب ہے
آفاق میں کھلی ہوئی حق کی کتاب ہے
سو جائے خاک پر تو یہی بو تراب ہے
اس کی نظر ہے عرش کا منظر لئے ہوئے
مٹھی میں ہے مشیّتِ داور لئے ہوئے

۷

خلاقیت کے فن میں ہے یکتا خدا کی ذات
قطرے کے دل میں جس نے بھریں قلزمی صفات
مٹی کو دے کے قوتِ تسخیرِ کائنات
روحِ عمل کو سونپ دی انسان کی حیات

ذوقِ عمل سے رشتۂ جاں استوار ہے
انسان کی بقا کا عمل پر مدار ہے

۸

انسان کو عمل سے ملا رتبۂ بلند
زورِ عمل سے اڑتا ہے افکار کا سمند
دیکھو جسے وہ روحِ عمل سے ہے بہرہ مند
خیرِ عمل ہے داورِ محشر کو بھی پسند

اجسام کا گزر نہیں دامانِ حشر میں
اعمال تولے جائیں گے میدانِ حشر میں

۹

حسنِ عمل تبسمِ گل کی ادا میں ہے
خورشید کے بدن کی نکھرتی ضیا میں ہے
جبریل کے پروں کی مہکتی ہوا میں ہے
حسنِ عمل تا آسیٔ آلِ عبا میں ہے
نخلِ علوئے کار کا ایک ایک پھل قبول
پڑھے اگر درود تو سارے عمل قبول

۱۰

لیکن عمل کے ساتھ اگر علمِ دیں نہیں
ایسے عمل کا پھر تو ٹھکانا کہیں نہیں
بے علم کی نظر میں گماں ہے یقیں نہیں
گلدان کا وہ پھول ہے جس کی زمیں نہیں
جاہل کو علم کیسے بھلا آشنا لگے
جب تک نہ شہرِ علمِ نبیؐ کی ہوا لگے

(۱۱)

حق بیں ہے حق نگار ہے حق آشنا ہے علم
جہلِ خرد مرض ہے تو اس کی دوا ہے علم
کونین میں وراثتِ کل انبیا ہے علم
قرآں کے بعد قصۂ اہلِ کسا ہے علم

جو چاہتا ہے قلب کو علم آشنا کرے
پہلے وہ شخص اجرِ رسالت ادا کرے

(۱۲)

انسانیت کے پیکرِ اصلی میں جاں ہے علم
دنیا تمام مثلِ دہن ہے زباں ہے علم
جاہل سمجھ رہا ہے کہولت نشاں ہے علم
صدیوں کا بوجھ سر پہ ہے لیکن جواں ہے علم

پروازِ علم دائرہ دو جہاں میں ہے
اس کا اثر مکاں ہی نہیں لامکاں میں ہے

۱۳

شامِ دیارِ جہل میں نورِ سحر ہے علم
اندھے معاشرے میں نبیؐ کی نظر ہے علم
جامد تعیّناتِ جہاں میں سفر ہے علم
نامعتبر ہیں سارے ہنر معتبر ہے علم
تقدیرِ علم رازِ خدائے انام ہے
وحیِ الٰہ علم کی خوشبو کا نام ہے

۱۴

باطل پرست دہر ہے حق کی طرف ہے علم
سارے فنون مثلِ گہر ہیں صدف ہے علم
نبّاضِ حال شارحِ عہدِ سلف ہے علم
ہم کیا ہیں خود نبیؐ نے کہا ہے نجف ہے علم
زیرِ قدم نہ تخت ہے سر پر نہ تاج ہے
بس اک صفت یہ ہے کہ سلونی مزاج ہے

۱۵

عالم اسی لئے تو ہے دنیا میں سرفراز
اس کا دلِ گداز ہے انسانیت نواز
دنیا میں حُبِ آلِ نبیؐ پر ہے اسکو ناز
اس کے لغت میں پنجتنی فکر ہے نماز
عالِم کو جب بھی روئے نبیؐ یاد آئے گا
ہو کر نجف سے ارضِ مدینہ میں جائے گا

۱۶

عالم کے ہر عمل کی ہے زینت جمالِ علم
اس کی نظر کو کرتا ہے صیقل جلالِ علم
ہے اس کا اجتہاد مطیعِ کمالِ علم
عالِم ہے مالدار بہ فیضانِ مالِ علم
قرآن اس کی فطرتِ احسن کے ساتھ ہے
عالِم کے سر پہ حضرتِ حجتؑ کا ہاتھ ہے

۱۷

عالِم کو اقتدار کی خواہش نہ اس کا ڈر
اس کا کسی رئیس کے در پر جھکا نہ سر
سارے جہاں میں مدرسۂ دیں ہے اسکا گھر
اس کے کمالِ علم کا ماخذ علیؑ کا دَر
نظریں علیؑ کے در سے ہٹاتا نہیں ہے وہ
دنیا اسے بلاتی ہے جاتا نہیں ہے وہ

۱۸

روئے زمیں پہ ایسا ہی اک نائبِ امام
جانِ نجف تھا قاسمِ خوئی ہے اس کا نام
جچتا تھا بس اسے لقبِ مرجعِ عوام
تالیف جس کی صبح تھی تصنیف جس کی شام
شیدائے دیں نقیبِ علوم و فنون تھا
اسکی رگوں میں موسیِٰ کاظمؑ کا خون تھا

(۱۹)

ایران کی زمیں سے یہ گوہر عیاں ہوا
طفلی میں جوہرِ شرفِ خانداں ہوا
عنوانِ داستانِ زبان و بیاں ہوا
جیسے لگیں نجف کی ہوائیں جواں ہوا
گزرا حصولِ علم کے ہر امتحان سے
باتیں شباب کرنے لگا آسمان سے

(۲۰)

فضلِ خدا سے اکبرِ خوئیؒ کا یہ پسر
ہونے لگا علوم کے مخزن سے بہرہ ور
طے درسِ داخلہ کی ہوئی جب رہِ سفر
پھر درسِ خارجہ پہ جمی فکرِ معتبر
اٹھارویں برس میں یہ علمی وقار تھا
اس کا مدرسینِ نجف میں شمار تھا

(۲۱)

اس کا شعورِ کسب تھا اس درجہ نکتہ رس
طلاب عصر گھومتے تھے اس کے پیش و پس
شرحِ حدیث و فقہ میں کٹتا تھا ہر نفس
تھی اس کو نشرِ علمِ ائمہ کی فکر بس

اس کے قلم کا زور ہے زندہ جہان میں
کچھ معجم الرجال میں کچھ البیان میں

(۲۲)

حاصل اسے تھی شفقتِ آقائے نائینی
سرکار بوالحسن سے ملی روح کو خوشی
عظمت تھی اس کے قلب میں جوادِ عصر کی
تھی رہنما ضیائے عراقی کی زندگی

کیا حق رسی تھی اس کے دلِ بامراد کی
یہ لوگ دے گئے ہیں سند اجتہاد کی

(۲۳)

اس نے دروسِ علم کے دورے کیے مدام
قرآں کی سند سے پڑھاتا رہا کلام
تفسیر کا سبق ہو کہ فتووں کا اہتمام
ہر ملک میں کیا تھا مدارس کا انتظام

دنیا جب اسکی فکر کو محور بنائے گی
منہاجِ صالحین گواہی میں آئے گی

(۲۴)

زندہ رہا وہ دین کی عظمت کے واسطے
لڑتا رہا نجف کی حفاظت کے واسطے
تیار ہو گیا وہ شہادت کے واسطے
لیکن جھکا نہ ظلم کی بیعت کے واسطے

سب کو غمِ حسینؑ کا ادراک دے گیا
صدام کو یزید کی پوشاک دے گیا

(۲۵)

جاہل کے ظلم و جور سے عالم کا خوں ڈرے؟
بد خصلتوں سے شرع کے حاکم کا خوں ڈرے؟
اہلِ فنا سے پیرِ قائم کا خوں ڈرے؟
صدّامیوں سے موسیٰ کاظمؑ کا خوں ڈرے؟

ظاہر میں جی رہے ہیں حقیقت میں مر گئے
اک موسوی سے وقت کے فرعون ڈر گئے

(۲۶)

جتنے بھی عالم علما ہیں جہاں میں آج
دیتے ہیں اس کی عظمتِ افکار کو خراج
پہنے ہے اب بھی وہ اَبدیت کا سر پہ تاج
اس کے قلم کی تاب ہے یا علم کا سراج

ہر علم کے جواز میں درسِ عمل بھی ہے
توضیح میں مسائلِ عالم کا حل بھی ہے

(۲۷)

وجہِ قرارِ دل زدہ گاں اس کا ہر عمل
اس کی کتابِ منتخبہ مسئلوں کا حل
اس کا ہر اک حوالہ دیں مستند اٹل
جس نے گرائے ضعفِ روایات کے محل
پتھر درِ فصیلِ جہالت پہ دھر دیئے
جھوٹے محدثین کے منہ بند کر دیئے

(۲۸)

اس کے ریاضِ علم کی نایاب ہر کلی
وہ خود چمن تھا باقرِ صدرؔ اس کی تازگی
سید حسن نے کشتِ ہدایہ کو دی تری
سید علی سے بڑھ گئی گلشن میں روشنی
بحر العلوم جس کی عطا شہر شہر ہے
وہ ایک باغِ قاسمِ خوئی کی نہر ہے

(۲۹)

دنیا میں اس کی فکر کے حامل ہیں بے شمار
ہر ملک میں ہے اس کی نیابت بروئے کار
شہرِ نجف میں شیخ بشیرِ نکو شعار
بیروت میں ہے مہدیِ شمس آج جلوہ بار
راتیں ہیں دن وحیدِ زماں کے شعور سے
قم جگمگا رہا ہے محمد کے نور سے

(۳۰)

یہ اس کی آرزو تھی کہ اس ارضِ پاک میں
ذرے زمیں کے اخترِ گردوں نشیں بنیں
محفوظ مومنین ہر اک ظلم سے رہیں
خود زندگی سلام کرے اس طرح جیئں
اس کی خوشی تھی جوہرِ قرآں عیاں کرے
رازِ احسن الحدیث کے طالب بیاں کرے

(۳۱)

وہ کربلا میں اس لئے جا کر ہوا مکیں
شبیرؑ کی وہ ملک ہے صدام کی نہیں
کیا تھی خطا جو زائروں پر گولیاں چلیں
کیا جرم تھا ہوا جو مقید زعیمِ دیں
دے کر اذیتیں اُسے بے ہوش کر دیا
بے وجہ اک کلیم کو خاموش کر دیا

(۳۲)

نظروں میں تھی حسینؑ کی سیرت جو جلوہ گر
مجبوریوں میں شکر کے سجدے تھے خاک پر
پیاسوں کو دے رہی تھی خراج اس کی چشمِ تر
لیکن اجل بھی آئی تو اس کا جھکا نہ سر
چشمِ وفا جہاں بھی ہے روئی ہے ہر جگہ
صدام اب کہیں نہیں خوئی ہے ہر جگہ

(۳۳)

ہم اس لئے ہیں اسکی جدائی میں خوں فشاں
وہ تھا علومِ آلِ محمدؐ کا ترجماں
وہ تھا یقیں کے شہر میں غارت گرِ گماں
ہیں مجتہد بہت مگر اس کا بدل کہاں
زخمِ نگاہ کی نہیں مرہم کی موت ہے
عالِم کی موت اصل میں عالَم کی موت ہے

(۳۴)

فکرِ حسینؑ اس کی حیاتِ ابد کا راز
اُس کے نفس کی آمد و شد کربلا نواز
عاشور کے نظامِ عمل پر تھا اسکو ناز
خم تھا درِ حسینؑ پہ اُس کا سرِ نیاز
وہ جانتا تھا فکرِ جہاں ساز ہے حسینؑ
ہر آدمی کے قلب کی آواز ہے حسینؑ

۳۵

وہ اشجعِ عرب وہ حسینؓ قضا اسیر
ابتک رواں ہے جس کی نگاہِ وفا کا تیر
جس کے چراغِ فہم کے عالم میں ہیں سفیر
کھولا یہ جس نے راز کہ انساں ہے باضمیر
روئے جفا پہ غازۂ اخلاص مل دیا
جس نے فراتِ ذہن کا رخ ہی بدل دیا

۳۶

اک آخری تفکرِ انساں کی حد حسینؓ
دل کی کتاب کا سبقِ مستند حسینؓ
جہدِ بقا میں ذہنِ اُمیہ کی رد حسینؓ
زندہ رہے گا دہر میں اب تا ابد حسینؓ
افکارِ نو جہاں کو دیئے غم شناس نے
حیراں سمندروں کو کیا جس کی پیاس نے

(٣٧)

جب سے بنا حسینؑ کا دم جانِ کربلا
شانِ فلک پہ ہنسنے لگی شانِ کربلا
دیکھو ذرا یہ صورتِ امکانِ کربلا
دنیا ہے ایک گوشۂ دامانِ کربلا
تحریکِ انقلاب جو رُو ارتقا کی ہے
اٹھے کہیں سے بھی وہ صدا کربلا کی ہے

(٣٨)

بے مثل و بے مثال وہ اصحابِ حق پسند
جن کی وفا سے سطحِ وفا ہو گئی بلند
تیر و تبر کا خوف اجل سے نہ فکر مند
میثمؓ کی طرح حکمِ امامت پہ کاربند
ایسا کمال بھر کے گئے ہیں نصاب میں
اک سطر پھر بڑھی نہ وفا کی کتاب میں

(۳۹)

وہ ہاشمی جواں ابو طالب کے نونہال
جن کی جبیں کو چھو نہ سکی گردِ انفعال
دکھلا کے شامیوں کو فنِ جنگ کا کمال
بیعت کا اپنے خون سے رد کر گئے سوال
اصحاب تھے نہ قلبِ شکستہ کا چین تھے
عاشور کی فضا میں اکیلے حسینؑ تھے

(۴۰)

تنہا حسینؑ کس سے کریں ابتلا کی بات
دیکھا پڑی ہے لاشِ برادر لبِ فرات
بکھری ہوئی ہے دشت میں لیلیٰ کی کائنات
گم سُم کھڑی ہیں مادرِ اصغر پسِ قنات
کس کو دکھائیں دل پہ جو غم ہیں پڑے ہوئے
زخموں کو گن رہے ہیں شہِ دیں کھڑے ہوئے

(۴۱)

کچھ سوچ کر جو خیمے میں آئے شہِ زماں
دیکھا کہ رو رہی ہیں شہیدوں کو بی بیاں
فرطِ عطش سے بالی سکینہ ہے نیم جاں
ہمشیر کے لبوں پہ ہے اکبرِ جواں ہناں
شہ نے کہا مہیب صعوبت کے سائے ہیں
زینبؑ اٹھو ہم آخری رخصت کو آئے ہیں

(۴۲)

گردابِ غم میں آج ہے آلِ نبیؐ کی ناؤ
جو آسکیں ذرا انھیں میرے قریب لاؤ
زینبؑ بس اتنا اور مسافر پہ رحم کھاؤ
گھر میں لباسِ کہنہ کوئی ہو تو لے کے آؤ
مجھ کو نہیں ہے فکر تنِ پاش پاش کی
بے حرمتی نہ ہو کہیں بیکس کی لاش کی

(۴۳)

عابدؑ کو احتیاط سے آواز دو بہن
بازو مرے، پکڑ کے وہاں لے چلو بہن
میرا سفر تمام ہے اب تم بڑھو بہن
اماں کھڑی ہیں دھوپ میں جلدی کرو بہن
کیا ظلم ہے حیات کا یوں مرحلہ کٹے
ماں گود میں لئے ہو پسر کا گلا کٹے

(۴۴)

زینبؑ مرے گلے سے جو نکلے لہو کی دھار
گھبرا کے ننگے سر نکل آنا نہ زینہار
گھر لوٹنے کو آئیں جو ظالم ستم شعار
بیمارِ کربلا مرے عابدؑ سے ہوشیار
یہ بات بھولنا نہ بہن تشنہ کام کی
چادر کو دے کے جان بچانا امام کی

۴۵

یہ کہہ کے آئے بسترِ بیمار کے قریں
ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے کہا میرے نازنیں
اٹھو کہ تم سے ملنے کو آیا ہے یہ حزیں
یہ کیا پدر بلاتا ہے تم بولتے نہیں
دشواریاں بہت ہیں محبت کی راہ میں
مل لو کہ پھر ملوں گا تمھیں قتل گاہ میں

۴۶

سن کر لبِ پدر سے مصیبت کی گفتگو
چشمِ مریضِ غم سے ٹپکنے لگا لہو
آیا جو روئے شہ پہ نظر خونِ آرزو
بستر پہ اٹھ کے ہاتھ میں لی تیغِ شعلہ خو
بولے کہ رن میں باپ کی نصرت کو جاؤنگا
بدلہ لہو کا لے کے میں خیمے میں آؤں گا

(۴۷)

بابا اسیلئے آپ ہیں عمو کہاں گئے
کیوں زخم آئے اکبرِ مہ رو کہاں گئے
چھوڑا چچا کو قاسمِ خوش خو کہاں گئے
جن سے تھی قتل گاہ میں خوشبو کہاں گئے
قسمت کسی کو ایسی نہ دکھلائے ٹھوکریں
زندہ جواں پسر ہو پدر کھائے ٹھوکریں

(۴۸)

کہنے لگے حسینؑ کہ اے میرے دلربا
لو یہ امانتِ شہِ کونین میں چلا
اب تم ہو اور آلِ محمد کا قافلہ
ماں بہنیں بے ردا ہوں تو نظریں نہ پھیرنا
یہ سوچ کر ابھی سے نگاہوں میں شام ہے
زینبؑ ہے تم ہو مجمعِ دربارِ عام ہے

۱۵۲

علم کی روشنی



علی حیدر اسیر فیض آبادی

کل بزم کن میں برتر و افضل ہے آدمی
خالق کا شاہکارِ مکمّل ہے آدمی

۱

آئینۂ علوم کے جوہر نظر میں ہیں
تہذیبِ آگہی کے سمندر نظر میں ہیں
دریائے معرفت کے شناور نظر میں ہیں
روشن ستونِ دینِ پیمبر نظر میں ہیں

ان سے جو کسبِ نور کرے کامیاب ہے
ذرہ نہیں وہ علم کا اک آفتاب ہے

۲

معراجِ عقل علم کی مسند کا ہے حصول
مرنا قبول جہل سے نسبت نہیں قبول
خلاقِ دوجہاں کے بدلتے نہیں اصول
کھل کر کبھی بکھرتے نہیں آگہی کے پھول

جو علم کے حصول کو مسلک بنائے گا
اس تک ہوائے جہل کا جھونکا نہ آئے گا

(۳)

ہے ابتدا تو علم کی پر انتہا نہیں
یہ ڈور وہ ہے دوسرا جس کا سرا نہیں
اترے جو بحرِ علم میں وہ ڈوبتا نہیں
اس دولتِ خرد کو ابد تک فنا نہیں

ہو جس قدر بھی صرف یہ گھٹتی نہیں کبھی
ہاں طاقِ کج نگاہی پہ سجتی نہیں کبھی

(۴)

چوری کا اس کی ڈر ہے نہ خدشہ زوال کا
موسم کے رنگ کا نہ اثر ماہ و سال کا
دھڑکا نہیں۔ ہے اس کو کسی اختلال کا
خود آئینہ ہے اپنے قد و خط و خال کا

دونوں جہاں میں افضل و برتر ہوا بشر
اس میں رچا بسا تو پیمبر ہوا بشر

۵

اس کے چمن میں آ نہیں سکتی کبھی خزاں
اس کا مکاں ہے ذہنِ بشر دل ہے آستاں
گردِ قدم ہے اس کی زمیں ہو کہ آسماں
ٹھہرا نہیں ہے آج تلک اس کا کارواں
اس بحرِ بے کنار کا ساحل کہیں نہیں
جادے ہزار اس کے ہیں منزل کہیں نہیں

۶

آسان بھی نہیں ہے یہ دشوار بھی نہیں
جادے میں اس کے وہم کی دیوار بھی نہیں
انداز میں غرور کا اظہار بھی نہیں
یہ نور وقفِ جبہ و دستار بھی نہیں
آلودگیِ دہر سے یہ بے نیاز ہے
محرابِ عقل و ہوش میں محوِ نماز ہے

۷

روزِ الست علم کی پہلی سحر ہوئی
جب عقل پیشِ ربِ علیٰ معتبر ہوئی
انسان کیا، ملک کو بھی اس کی خبر ہوئی
دستارِ علم زینتِ فرقِ بشر ہوئی
کل بزمِ کن میں برتر و افضل ہے آدمی
خالق کا شاہکارِ مکمل ہے آدمی

۸

حیوان کو بھی عقل کا ساغر دیا گیا
لیکن بقدرِ ظرف یہ جوہر دیا گیا
ذہنِ بشر کو فہم سے یوں بھر دیا گیا
کل علمِ کائنات کا دفتر دیا گیا
نظریں اٹھیں سمجھ میں سب اسرار آگئے
زیرِ قدم ثوابت و سیار آگئے

۹

بھیجے گئے زمیں پہ پیمبر علوم کے
ذہنِ بشر پہ کھلنے لگے در علوم کے
ممتاز خلق میں ہوئے رہبر علوم کے
چھلکائے اہلِ علم نے ساغر علوم کے
ایجاد کا سرور بڑھا عام ہوگیا
ماضی بس ایک ٹوٹا ہوا جام ہوگیا

۱۰

پوشیدہ تھیں زمیں کی تہیں آئینہ ہوئیں
پہنائیاں خلاؤں کی آنکھوں پہ وا ہوئیں
اور کہکشائیں جادۂ فکرِ رسا ہوئیں
جتنی مسافتیں تھیں وہ سب گردِ پا ہوئیں
انساں قیودِ وہم سے آزاد ہوگیا
شہرِ شعور و عقل میں آباد ہوگیا

(۷)

روزِ الست علم کی پہلی سحر ہوئی
جب عقل پیشِ ربِ علیٰ معتبر ہوئی
انسان کیا، ملک کو بھی اس کی خبر ہوئی
دستارِ علم زینتِ فرقِ بشر ہوئی
کل بزمِ کن میں برتر و افضل ہے آدمی
خالق کا شاہکارِ مکمل ہے آدمی

(۸)

حیوان کو بھی عقل کا ساغر دیا گیا
لیکن بقدرِ ظرف یہ جوہر دیا گیا
ذہنِ بشر کو فہم سے یوں بھر دیا گیا
کل علمِ کائنات کا دفتر دیا گیا
نظریں اٹھیں سمجھ میں سب اسرار آگئے
زیرِ قدم ثوابت و سیّار آگئے

۹

بھیجے گئے زمیں پہ پیمبر علوم کے
ذہنِ بشر پہ کھلنے لگے در علوم کے
ممتاز خلق میں ہوئے رہبر علوم کے
چھلکائے اہلِ علم نے ساغر علوم کے
ایجاد کا سرور بڑھا عام ہوگیا
ماضی بس ایک ٹوٹا ہوا جام ہوگیا

۱۰

پوشیدہ تھیں زمیں کی تہیں آئینہ ہوئیں
پہنائیاں خلاؤں کی آنکھوں پہ وا ہوئیں
اور کہکشائیں جادۂ فکرِ رسا ہوئیں
جتنی مسافتیں تھیں وہ سب گردِ پا ہوئیں
انساں قیودِ وہم سے آزاد ہوگیا
شہرِ شعور و عقل میں آباد ہوگیا

۱۱

گیتی کے دل سے روحِ حرارت کشید کی
ذرات میں چھپی ہوئی طاقت کشید کی
شیشے میں آفتاب کی حدت کشید کی
ذہنِ بشر نے برق کی فطرت کشید کی
باوصف ان کے خام ہے ذوقِ ہنر ابھی
تحقیق و تجربات ہیں گرمِ سفر ابھی

۱۲

تخریب کی طرف بھی قدم ہیں بڑھے ہوئے
تعمیر کے بھی ذہن میں جادے سجے ہوئے
دنیا کو فتح کرنے کی حسرت لئے ہوئے
جھولی میں تابکار عناصر بھرے ہوئے
انساں ہے مدتوں سے اسی انہماک میں
بیٹھا ہے کائنات پہ قبضے کی تاک میں

(۱۳)

پائے طلب سے اپنے خلاؤں کو روند کے
نادیدہ منزلوں کی تمنا لیے ہوئے
یہ دھن ہے جا کے اوجِ ثریا پہ سانس لے
اور پھر وہاں سے دوسری دنیاؤں کو بڑھے
اتنی بلند سازِ تجسس کی لے کرے
چشمِ زدن میں ساری مسافت کو طے کرے

(۱۴)

یہ کارگاہِ علم میں ہے گرمئ ستیز
خود تجربوں کی دھن میں زمیں پر ہے شعلہ ریز
راکٹ بنائے چلنے میں آواز سے بھی تیز
جوشِ سفر میں چاند سے آگے ہے جست خیز
ناکامیوں کا ہمتِ دل پر اثر نہیں
کل کس جگہ قیام کرے کچھ خبر نہیں

۱۵

یہ تو ہے ارتقائے ریاضی کی داستاں
ہو جائے کچھ زبونیٔ کردار بھی بیاں
یوں اڑ رہی ہیں خلق و محبت کی دھجیاں
ہر قوم بے سکوں ہے تو ہر شخص بے اماں
رستے فرار کے ہیں نہ گوشہ پناہ کا
پوری زمین حلقہ ہے اک قتل گاہ کا

۱۶

گردابِ انتشار میں فکرِ بشر ہے آج
انسان اپنی زیست پہ خود نوحہ گر ہے آج
ہر آنکھ مبتلائے فریبِ نظر ہے آج
دل کا یقین ہے نہ خرد معتبر ہے آج
ہر سمت ظلمتیں ہیں کدھر جائے کیا کرے
حیراں ہے زندگی کہ کسے رہنما کرے

۱۷

ناپید ہے سکون بھی جینا گراں بھی ہے
بدلی ہوئی زمین بھی ہے آسماں بھی ہے
ذہنوں میں اضطراب کا سیلِ رواں بھی ہے
شعلے بھی نفرتوں کے حسد کا دھواں بھی ہے
ایک اک نفس میں زہر پیئے جا رہے ہیں لوگ
کتنی تمازتوں میں جیئے جا رہے ہیں لوگ

۱۸

یہ دورِ ارتقائے خرد بھی عجیب ہے
بوتا ہے اضطراب سکوں کا نقیب ہے
یہ جانتے ہوئے کہ اجل سے قریب ہے
انسان اپنی ذات کا خود ہی رقیب ہے
کب مڑ کے دیکھتا ہے کسی انتباہ پر
ہے گامزن خود اپنی ہلاکت کی راہ پر

(۱۹)

یہ راستہ ہے دامِ سیاست کا راستہ
یہ راستہ ہے جبرِ حکومت کا راستہ
جمہوریت کے نام پہ وحشت کا راستہ
دعوے ہیں زندگی کے ہلاکت کا راستہ
دیکھو تو ہیں گلاب کے تختے بچھے ہوئے
سوچو تو گام گام ہیں کانٹے اُگے ہوئے

(۲۰)

اس راستے میں حدِ نظر تک سراب ہے
ایک ایک سانس لمحۂ صد اضطراب ہے
اس راہ میں سکوں بھی پیامِ عذاب ہے
ہر پیکرِ تراب کی مٹی خراب ہے
اس درجہ ٹھوکریں کہ سنبھلنا محال ہے
قوموں کی آبرو کا چمن پائمال ہے

۲۱

یہ راہ ظلم و جبر و شقاوت کی راہ ہے
بغض و عناد و کینہ و نفرت کی راہ ہے
رسوائیوں کا جادہ ہے ذلّت کی راہ ہے
کتنی مہیب اہلِ سیاست کی راہ ہے
لوری فریب و مکر نے دی سوگئی حیات
اٹھا غبار راہ میں گم ہوگئی حیات

۲۲

کیا خوب یہ نظامِ سیاست ہے دیکھئے
جمہور کے حقوق بالاعلان دے دیئے
کہنے کو تو عوام کے چاکِ جگر سیئے
لیکن نہ بدلے خوئے امارت کے زاویئے
سورج نکل رہا ہے مگر روشنی نہیں
بارش تو ہے غریب کی کھیتی ہری نہیں

۲۳

یوں پرچمِ نظام سنبھالے ہیں خاص لوگ
یہ خاص کھیل کھیلنے والے ہیں خاص لوگ
باطل سیاستوں کے حوالے ہیں خاص لوگ
حرص و ہوس کی گود کے پالے ہیں خاص لوگ
اغراض کے حصول میں یہ باکمال ہیں
مکر و دغا میں آپ ہی اپنی مثال ہیں

۲۴

ہر ملک میں ہے ایسے ہی لوگوں کا اقتدار
ان کی نظر کا رقص ہے ماحول کا فشار
آجائے ند میں عدل کی ایسوں کا جب وقار
اٹھتا ہے ان کے حکم سے طوفانِ انتشار
خود کو سنوارتے ہیں فضا کو بگاڑ کے
ہوتے ہیں شاد ماؤں کی گودیں اجاڑ کے

(۲۵)

حاصل انہیں ہے ذہنوں کی تقسیم میں کمال
ان کو وطن کا درد نہ ملت کا کچھ خیال
لاتے ہیں ابرِ نطق سے عشرت کی ژالہ گال
ہوتی ہے ان کے قدموں سے تہذیب پائمال
آدابِ زندگی کو مٹاتے ہیں بے دریغ
انسانیت کا خون بہاتے ہیں بے دریغ

(۲۶)

ہر گوشۂ حیات میں بوتے ہیں انتشار
تاروں میں روح کی یہ پروتے ہیں انتشار
دوشِ سیاسیات پہ ڈھوتے ہیں انتشار
ایوانِ علم تک میں سموتے ہیں انتشار
تخریب کے محاذ سے پیچھے ہٹے نہیں
کیا مدرسوں کا ذکر ہے معبد بچے نہیں

(۲۷)

کیا کیا جہاں میں اہلِ سیاست نے گل کھلائے
حیوان جیسے لڑتے ہیں انسان یوں لڑائے
فکرِ غلط نے روز تماشے نئے دکھائے
لاشوں پہ بے گناہوں کی اپنے محل اٹھائے
مقتول کا جنازہ اٹھا کر بھی روتے ہیں
محنت کشوں کے خوں میں نہا کر بھی سوئے ہیں

(۲۸)

یہ موجِ انتشار کی زنجیر دیکھئے
بگڑی ہوئی عراق کی تقدیر دیکھئے
افغان کے زوال کی تصویر دیکھئے
شعلوں کی زد میں جنتِ کشمیر دیکھئے
لبنان جل رہا ہے فلسطین اجڑ گیا
قوموں کے اتحاد کا نقشہ بگڑ گیا

۲۹

اپنے وطن کے حالِ زبوں پر بھی اک نظر
ہر شہر درس گاہِ جرائم ہے الحذر
حاکم ہیں یوں عوام کی حالت سے بے خبر
خوف احتساب کا ہے نہ ردِ عمل کا ڈر
کس کے حقوق کیا ہیں کبھی مانتے نہیں
جس سے غرض نہ ہو اسے پہچانتے نہیں

۳۰

بھولے نہ ہوں گے لوگ ابھی وہ دورِ ابتلا
تھی انتشارِ فکر و نظر جس کی انتہا
دشمن نے پہلے توڑ کے ملت کا حوصلہ
پھر سازشوں سے ملک کا بازو جدا کیا
کیا تبصرہ کرے کوئی باطل نظام پر
کتنا لہو بہا ہے سیاست کے نام پر

۳۱

یہ خون جو بہا ہے مسلماں کا خون ہے
انصاف کا لہو ہے یہ ایماں کا خون ہے
یہ پیکرِ شرافتِ انساں کا خون ہے
دینِ رسولِ حق کی رگِ جاں کا خون ہے
اس سانحے پہ ساری دکانیں خموش ہیں
کیوں مفتیانِ دیں کی زبانیں خموش ہیں

۳۲

فتویٰ فروش وقت کے حاکم کے زر خرید
صہبائے جہل ذہنوں میں کرتے ہیں یہ کشید
ان کی زبان نفرتِ باہم کی ہے کلید
بہکا رہے ہیں ذہنوں کو شیطان کے مرید
سیکھا ہے درسگاہوں میں فن افتراق کا
ان کے دلوں میں زہر بھرا ہے نفاق کا

(۴۳)

ان مفتیوں کی فوج کے ڈیرے بہت سے ہیں
صبحوں کے نام پر یہ اندھیرے بہت سے ہیں
یہ زاغ وہ ہیں جن کے بسیرے بہت سے ہیں
ذہن و دل و نگاہ کے گھیرے بہت سے ہیں
پھیلا رہے ہیں دھند یہ ہر سو عناد کی
فصلیں اگا رہے ہیں زمیں پر فساد کی

(۴۴)

یہ چاہتے ہیں دین و سیاست کا ارتباط
دنیا پرستیوں سے شریعت کا ارتباط
باطل سے حق کا نور سے ظلمت کا ارتباط
ممکن کہاں ہے علم و جہالت کا ارتباط
امت رسولِؐ حق کے برابر ہوئی ہے کیا؟
صحرا کی گرد عرش کی ہمسر ہوئی ہے کیا؟

(۳۵)

اک کھیل ان کے واسطے دیں کے اصول ہیں
قرآں سے پوچھ لو یہ ظلوم و جہول ہیں
ہر گفتگو فضول مباحث فضول ہیں
ان کو قبول ہم نہ ہمیں یہ قبول ہیں
حق پر جو ہیں وہ کچھ انہیں گردانتے نہیں
کانٹوں کو ہم گلاب کبھی مانتے نہیں

(۳۶)

ان کو صداقتِ علوی سے ہے انحراف
سفیانیت کے حجروں میں کرتے ہیں اعتکاف
اپنی زباں سے گو نہیں کرتے یہ اعتراف
بادل یہ کس فضا کے ہیں ظاہر ہے صاف صاف
سب کچھ عیاں ہے ان کے طریقِ نمود سے
اٹھتی ہے بھاپ مطبخِ آلِ سعود سے

(۳۷)

ایسے بھی کچھ مگر ہیں ستارے علوم کے
پھوٹے ہیں جن کی فکر سے دھارے علوم کے
واضح کیے عمل سے اشارے علوم کے
جادے قدم قدم پہ سنوارے علوم کے
تنویر پا رہے تھے یہ حیدر کے نام سے
مربوط ان کی فکر تھی فکرِ عوام سے

(۳۸)

ان کو خراج دیتا ہے صدیوں کا ارتقا
یہ آئینہ ہیں علم و عمل کے شعور کا
کردار کا کمال، شرافت کی انتہا
لو دے رہے ہیں آج بھی ان کے نقوش پا
حسنِ ضمیرِ علم کے محرم یہی تو ہیں
چشمِ جہاں میں مرجعِ عالم یہی تو ہیں

۳۹

قرآن ان کی فکر کا محور بنا رہا
پیشِ نگاہ جادۂ خیر الوریٰ رہا
دل ان کا شہرِ علم کے در پر جھکا رہا
سجدوں میں ان کے سجدۂ سرور بسا رہا
دے گی تابہ حشر دیارِ وفا کی خاک
ان کی جبیں کا نور بنی کربلا کی خاک

۴۰

یثرب کا نور ان کی بصیرت پہ چھا گیا
ان کو فضائے جبر میں جینا سکھا گیا
صبر و رضا کی شمعیں دلوں میں جلا گیا
علم و عمل کا مظہرِ اعلیٰ بنا گیا
اعصاب مضمحل نہ ہوئے جس قدر چلا
بھٹکا نہیں جو ان کی طرف دیکھ کر چلا

(٤١)

ان کی نظر سے دانش و خود آگہی ملی
دم توڑتی خرد کو نئی زندگی ملی
منزل کا اعتبار ملا رہبری ملی
ذہنوں کو جس روش کی طلب تھی وہی ملی
اک شمع بھی فضاؤں کی ظلمت میں کم نہیں
یہ آسرا امام کی غیبت میں کم نہیں

(٤٢)

ملت کو ان کے عزم نے وہ حوصلہ دیا
فتنہ یزیدیت کا جب ابھرا دبا دیا
بستِ حسینیت سے دلوں کو جگا دیا
ایوانِ ظلم و جور کو ٹھوکر سے ڈھا دیا
ایماں کے ہمرکاب رضائے اللہ ہے
ابتک وہ انقلابِ خمینی گواہ ہے

(۴۳)

صحرا میں پھول جس نے کھلائے وہ انقلاب
جلوے حسینیت کے دکھائے وہ انقلاب
فرعونیت کے قصر گرائے وہ انقلاب
باطل کے نقش جس نے مٹائے وہ انقلاب
رخشاں تھی موجِ نور جہاں تک نظر گئی
صحنِ وطن میں حق کی تجلّی بکھر گئی

(۴۴)

جس نے بساطِ جبر الٹ دی وہ انقلاب
تلوار دستِ ظلم سے چھینی وہ انقلاب
جس نے مٹا دی سطوتِ شاہی وہ انقلاب
کھرچے دلوں سے داغِ غلامی وہ انقلاب
راہوں میں جتنے خار بچھے تھے ہٹا دیئے
آزادیوں کے پھول وطن میں کھلا دیئے

(۴۵)

اِس انقلابِ نو کی جہاں تک دھمک گئی
دیوار کفر و بغض و دغا کی درک گئی
باطل کی سانس اس کے گلے میں اٹک گئی
جیسے زمین پاؤں تلے سے سرک گئی
سچائیوں کی فتح کا انداز دیکھئے
اک نائبِ امام کا اعجاز دیکھئے

(۴۶)

ہر خطۂ جہاں میں ہوئے نائبِ امام
تبلیغ و حفظِ دینِ پیمبر تھا جن کا کام
روشن ہے جن کے علم و تدبر کا احتشام
اِن نائبوں میں مصطفےٰ جوہر کا بھی ہے نام
دل میں کھلا ہوا جو مودت کا پھول ہے
یہ مرتبہ یہ اوج عطائے بتولؑ ہے

(۴۷)

تقویٰ بدوش ان کی سحر بھی تھی شام بھی
پیتے تھے ہر نفس یہ تولّا کا جام بھی
یہ عاشقِ نبیؐ تھے فدائے امام بھی
حاصل تھا علمِ دین بھی علمِ کلام بھی
ہم فکر و ہم مزاجِ ابوذرؓ کہیں انہیں
مردِ فقیہہ و بندۂ حیدر کہیں انہیں

(۴۸)

کردار اک کتاب کی صورت کھلا ہوا
لہجہ میں علم و حلم و تدبر بسا ہوا
سجدے کا داغ لوحِ جبیں پر سجا ہوا
سانسوں کی موج موج میں تقویٰ بچا ہوا
جو فیضیاب ان سے ہوا سرفراز ہے
وہ شخصیت کہ جس پہ شرافت کو ناز ہے

(۴۹)

ہو دوستوں کی بزم تو ہر شخص کے حبیب
دنیا کی لذتوں سے الگ دین کے قریب
کم لوگ ہیں کہ جنکو یہ سب وصف ہیں نصیب
عالم، خطیب، اہلِ نظر، شاعر و ادیب
رنگِ سخن طہارت و عصمت لئے ہوئے
شعر و ادب گلاب کی نکہت لئے ہوئے

(۵۰)

شاعر تھے آپ بیٹا بھی شعر و ادب کی جاں
دونوں کے ذوقِ فکر میں کچھ فرق ہے کہاں
گر آپ علم و فقہ کے کہلائے آسماں
یہ بھی فقیہہ و عالمِ دوراں ہیں بے گماں
سب وصف جمع ہیں ابوطالب میں آپکے
"بیٹا وہی قدم بہ قدم ہو جو باپ کے"
میر انیسؔ

۵۱

حاضر ہوا جو کوئی مصائب میں مبتلا
قرآن سے دعاؤں کا نسخہ بتا دیا
دامن اگر بڑھا کسی غربت نصیب کا
دستِ عطا سے حسبِ ضرورت عطا ہوا
شکوہ کسی کو لب پہ نہ لانے دیا کبھی
سائل کو نامراد نہ جانے دیا کبھی

۵۲

منبر سے علمِ دین کے گوہر لٹائے ہیں
ذہنوں میں معرفت کے ستارے سجائے ہیں
بھٹکے ہوؤں کو جادۂ ایماں پہ لائے ہیں
جوہرؔ نے وہ خطاب کے جوہر دکھلائے ہیں
جب فرض کر چکے وہ ادا تھک کے سو گئے
ذہنوں میں کربلا کے اجالے سمو گئے

۵۳

ہر انقلابِ فکر کی محور ہے کربلا
سچائیوں کی فتح کا مستر ہے کربلا
ذہنِ بشر کی آج بھی رہبر ہے کربلا
آرام گاہِ سبطِ پیمبر ہے کربلا
تمیزِ نیک و بد کی ضیا کربلا میں ہے
انسانیت کا راہنما کربلا میں ہے

۵۴

ہے جذب جس کی خاک میں قرآں وہ کربلا
جس میں غروب ہے مہِ تاباں وہ کربلا
طاقِ حرم ہے جس سے درخشاں وہ کربلا
جس پر دلِ رسول ہے نازاں وہ کربلا
ذروں میں جس کے نورِ حرا ہے رچا ہوا
ہے جس کی سطحِ فکر پہ کعبہ سجا ہوا

۵۵

ہے کربلا حیات کی صورت گری کا نام
شائستگی کے ساتھ متانت روی کا نام
فکر و شعور و فہم کی تابندگی کا نام
قلب و نظر کی نکھری ہوئی روشنی کا نام
ذہنِ بشر پہ نور کی صیقل ہے کربلا
خود آگہی کی شرحِ مکمل ہے کربلا

۵۶

پیمانۂ حقوق و فرائض ہے کربلا
انسانیت نے پائی یہیں مستقل بقا
ایثار و ضبطِ نفس کا جوہر یہیں کھلا
نکھرا اسی مقام پہ آئینۂ وفا
ہر سمت ظلمتوں کا بسیرا تھا دہر میں
ہوتی نہ کربلا تو اندھیرا تھا دہر میں

۵۷

واضح اسی جگہ ہوئیں قدریں حیات کی
یہ حدِ آخری ہے بشر کے صفات کی
خم اس کی خاک پر ہے جبیں کائنات کی
یہ سرزمیں گواہ ہے خالق کی ذات کی

ہم اور کربلا کے تعارف میں کیا کہیں
بس یہ کہ فرشِ خاک پہ عرشِ علیٰ کہیں

۵۸

لاریب اس زمیں کی ضیا ہے حسینؑ سے
ہر ذرہ رشکِ طور بنا ہے حسینؑ سے
یہ سارا افتخار ملا ہے حسینؑ سے
مٹی بھی اس کی خاکِ شفا ہے حسینؑ سے

قرآنِ دل کی آیۂ محکم ہے کربلا
ہر زخمِ روح کے لئے مرہم ہے کربلا

۵۹

جو شمعِ منزلِ ابدیت ہے وہ حسینؑ
جو خود رسولِ حق کی ضرورت ہے وہ حسینؑ
معراجِ سجدہ جس کی عبادت ہے وہ حسینؑ
اسلام جس کے خون کی قیمت ہے وہ حسینؑ

جس نے رخِ نفاق سے پردہ ہٹا دیا
احساسِ حق کو جس نے مجسم بنا دیا

۶۰

جس کی عبا کو چھو نہ سکی گردِ کائنات
وسعت میں جس کے سجدے سے کم حدِ ممکنات
جانِ رسول نورِ ازل کبریا صفات
جس سے زبان و دل کو ملی دائمی حیات

جس کا شعار مرضیٔ یزداں سے کم نہیں
جس پر نظر تلاوتِ قرآں سے کم نہیں

۶۱

جس کا شعار عدلِ الٰہی کا آئینہ
جس کا شعور صدق نگاہی کا آئینہ
جس کا مزاج دین کی شاہی کا آئینہ
ہر بات جس کی حق کی گواہی کا آئینہ
جو وحدتِ اللہ کی تفسیر کر گیا
کلمے کو جو شعور پہ تحریر کر گیا

۶۲

جس نے مزاجِ دہر کو حق آشنا کیا
فکر و نظر کے بند دریچوں کو وا کیا
جس نے وقارِ نوعِ بشر کو سوا کیا
وہ جس نے زیرِ تیغ بھی سجدہ ادا کیا
جو بندگی کا اوج دکھا کر چلا گیا
جو عبدیت کی ساری فضاؤں پہ چھا گیا

۶۳

ایمان جس کے سجدے کی منزل ہے وہ حسینؑ
قرآن جس کے خون میں شامل ہے وہ حسینؑ
زہراؑ کی تربیت کا جو حاصل ہے وہ حسینؑ
جو مصطفےٰؐ شعور کا حامل ہے وہ حسینؑ
قربانیوں کے ظرف میں ڈھالا گیا جسے
کرب و بلا کے واسطے پالا گیا جسے

۶۴

وہ کربلا جو دینِ نبیؐ کی پناہ تھی
جو خیر و شر کی سب سے بڑی رزم گاہ تھی
انسانیت کے ٹوٹتے دل کی کراہ تھی
وہ جس پہ خود مشیتِ رب کی نگاہ تھی
خوں دے کے جس کا رنگ نکھارا حسینؑ نے
خود کو مٹا کے جس کو سنوارا حسینؑ نے

۶۵

وہ کربلا جہاں پہ قیامت بپا ہوئی
عترتِ نبی کی قید ہوئی بے ردا ہوئی
ہر ظلم ہر ستم کی جہاں انتہا ہوئی
وہ کربلا کہ قتل جہاں مامتا ہوئی
ہر آہ گھٹ کے رہ گئی دیوار در کے پاس
رونے نہ پائی ماں کوئی لاشِ پسر کے پاس

۶۶

قاسم کی لاش ہوگئی پامال دشت میں
زینبؑ کے قتل ہو گئے اطفال دشت میں
اکبر کا کیا بیان ہو احوال دشت میں
ماؤں سے چھٹ کے سو گئے سب لال دشت میں
گھر کے چراغ بجھ گئے سب جا کے گھر سے دُور
اصغر بھی دفن ہو گئے ماں کی نظر سے دُور

۶۷

بیمار امام اور وہ سلاسل کی سختیاں

زخمِ بدن سے پاؤں کے چھالوں سے خوں رواں
دُرّوں کی سائیں سائیں وہ پیہم کہ الاماں
ایسے ستم کہ دیکھ کے روتا تھا آسماں
ہوتی تھیں جب بلند کراہیں امام کی
آتی تھی زلزلے میں زمیں راہِ شام کی

۶۸

تھا سامنے جو نیزۂ خونی پہ شہ کا سر
بابا سے بولے نظریں اٹھا کر بہ چشمِ تر
یہ ظلم آپ دیکھتے ہیں شاہِ بحر و بر
اب بد دعا تڑپتی ہے میری زبان پر
آئی صدا کہ لال میرے لال صبر کر
قربانیاں نہ ہوں مری پامال صبر کر

(۶۹)

سر کو جھکا کے عابدِ دلگیر رہ گئے
چپ رہ کے تازیانوں کا ہر وار سہ گئے
لیکن جو اشک شام کی راہوں میں بہہ گئے
دنیا سے کربِ روح کی روداد کہہ گئے
جب کوئی فرشِ مجلس و ماتم بچھائے گا
عابدؑ کا ذکر خون کے آنسو رُلائے گا

(۷۰)

بیمار امام اور وہ تشدد کہ الاماں
دُرّوں سے جسمِ پاک پہ کھینچے ہوئے نشاں
ہمراہ ایک رسی میں جکڑی وہ بی بیاں
ظالم کا حکم آنکھ سے آنسو نہ ہوں رواں
گردن کے زخم پاؤں کے چھالو سلام لو
اے صبرِ بیکراں کے حوالو سلام لو

سلام

نسیم ردولوی

کیا اس کے باب میں کوئی حرفِ ثنا لکھے
جس کا لہو دلوں پہ کتابِ وفا لکھے

خوں رو رہا ہے بس اسی اندوہ میں قلم
کس زاویئے سے کربِ عطش کی صدا لکھے

بجھ کر چراغِ خیمہ اگر رہ گیا تو کیا
چہروں کی روشنی نے خطوطِ وفا لکھے

ایثار صبر شکر وفا عزم بندگی
کیا کیا خرد نے معنیِ کرب و بلا لکھے

کیا تیری رفعتوں کا تصوّر ہو اے حسینؑ
جب فکر اپنی حد کو تری گردِ پا لکھے

لکھ تو چکا قلم مرا زنداں کی کیفیت
سہمی ہوئی کلی کی خموشی کو کیا لکھے

ڈھانپے تھے جس نے راہ میں سیدانیوں کے سر
تاریخ اُس غبار کا کیا مرتبہ لکھے

مل جائے اے نسیم اُسے رومالِ فاطمہؑ
یوں چشمِ تر سلامِ شہِ کربلا لکھے

○

سلام

منقاد حیدر اختر ہاشمی

قلبِ وفا کو خونِ تمنا ہی راس ہے
اب تو غمِ حسینؑ ہی دل کی اساس ہے

پیاسوں کا معجزہ یہ نہیں ہے تو پھر ہے کیا
دریا ہے پاس ساحلِ دریا کو پیاس ہے

شبیرؑ ہے جمالِ قبائے پیمبری
لیکن یزید جسم کا میلا لباس ہے

ہم ملتے ہیں زینبؑ و سجادؑ کے اصول
ظالم سے احتجاج کا ڈھنگ اپنے پاس ہے

کامل یقیں ہے روحِ روانِ حسینیت
لیکن یزیدیت تو مکمل قیاس ہے

مہکا گیا حیات کو خونِ رگِ حسینؑ
ہر بوند میں لہو کی گلستاں کی باس ہے

ممکن نہیں کہ ذکرِ علمدار مٹ سکے
ہر دور پر محیط سکینہ کی پیاس ہے

یہ ہے شہادتِ علی اصغرؑ کا معجزہ
صدیاں گذر گئی ہیں مگر دل اداس ہے

اختر عجیب راز یہ بتلا گئے حسینؑ
جو کربلا نواز ہے وہ حق شناس ہے

سلام

منقاد حیدر اختر ہاشمی

بلند اتنا ہوا آفتابِ عشقِ علیؑ
نہ ہوسکا کوئی اب تک جوابِ عشقِ علیؑ

قضا کے سامنے لب پر ہے یا علیؑ کی صدا
خزاں میں دیکھو کھلا ہے گلابِ عشقِ علیؑ

بڑا مزہ ہو جو محشر میں خود خدا پوچھے
حسابِ حشر سے پہلے حسابِ عشقِ علیؑ

خدا پسند نبیؐ آشنا عمل یہ ملا
سمجھ کے میں نے کیا ارتکابِ عشقِ علیؑ

کتابِ دہر بھی اک دن تو بند ہوگی مگر
کھلی رہے گی ہمیشہ کتابِ عشقِ علیؑ

مرے خدا مری الفت کا ماجرا مت پوچھ
مجھے تو آتا ہے بس اک نصابِ عشقِ علیؑ

یہ چار دن کی ہے دنیا یہاں جزا کیسی
کھلے گا خلد میں کارِ ثوابِ عشقِ علیؑ

علی کا ذکر مٹے گا نہ قلبِ عالم سے
شبابِ دینِ خدا ہے شبابِ عشقِ علیؑ

ہے میکشی کا اثر اختلالِ ذہن مگر
بہکنے دیتی نہیں ہے شرابِ عشقِ علیؑ

ملی نہ فرصتِ علم و عمل کبھی اختر
تمام عمر پڑھی بس کتابِ عشقِ علیؑ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام

مولانا محمد مصطفیٰ جوہر اعلی اللہ مقامہ

آیۂ تطہیر کے مقصد کا محور فاطمہؑ — یعنی شرحِ عظمتِ نورِ پیمبرؐ فاطمہؑ
اُن سے پھیلا دینِ حق اُن سے بڑھی نسلِ رسول — ایک کوثر ہیں علیؑ اور ایک کوثر فاطمہؑ
کشتیٔ دینِ خدا کی ناخدا ثابت ہوئیں — شبرؑ و شبیرؑ جیسے دے کے لنگر فاطمہؑ
نام ہے تسبیحِ زہرؑا، کام تسبیحِ خدا — ذکر تیرا ذکرِ حق اللہ اکبر فاطمہؑ
سُن رہی ہیں گفتگوئے ربّ و جبریلِ امیں — چادرِ تطہیر میں، عرشِ بریں پر فاطمہؑ
تیری خدمت میں ہوا فضّہ کو قرآں برزباں — اے بِسان اللہ، اے ایمان پرور فاطمہؑ
آیۂ تطہیر لکھنے کے لئے تقدیر نے — تیری سیرت کو بنایا اس کا مسطر فاطمہؑ
وحی و قرآں سے خدا تو یوں بسائے تیرا گھر — اور اُجاڑے اُمتِ احمدؐ وہی گھر فاطمہؑ
تو کرے اپنے جنازے کے لئے شب کو پسند — اور تری دختر ہو بلووں میں کھلے سر فاطمہؑ
زہر شبرؑ کو دیا ٹکڑے جگر کے ہوگئے — پھر گیا شبیرؑ کی گردن پہ خنجر فاطمہؑ

آیتِ تطہیر کہتی ہے زبانِ حال سے
کل عصمت مصطفیٰؐ اور اس کا جوہر فاطمہؑ